www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

فروری 2019

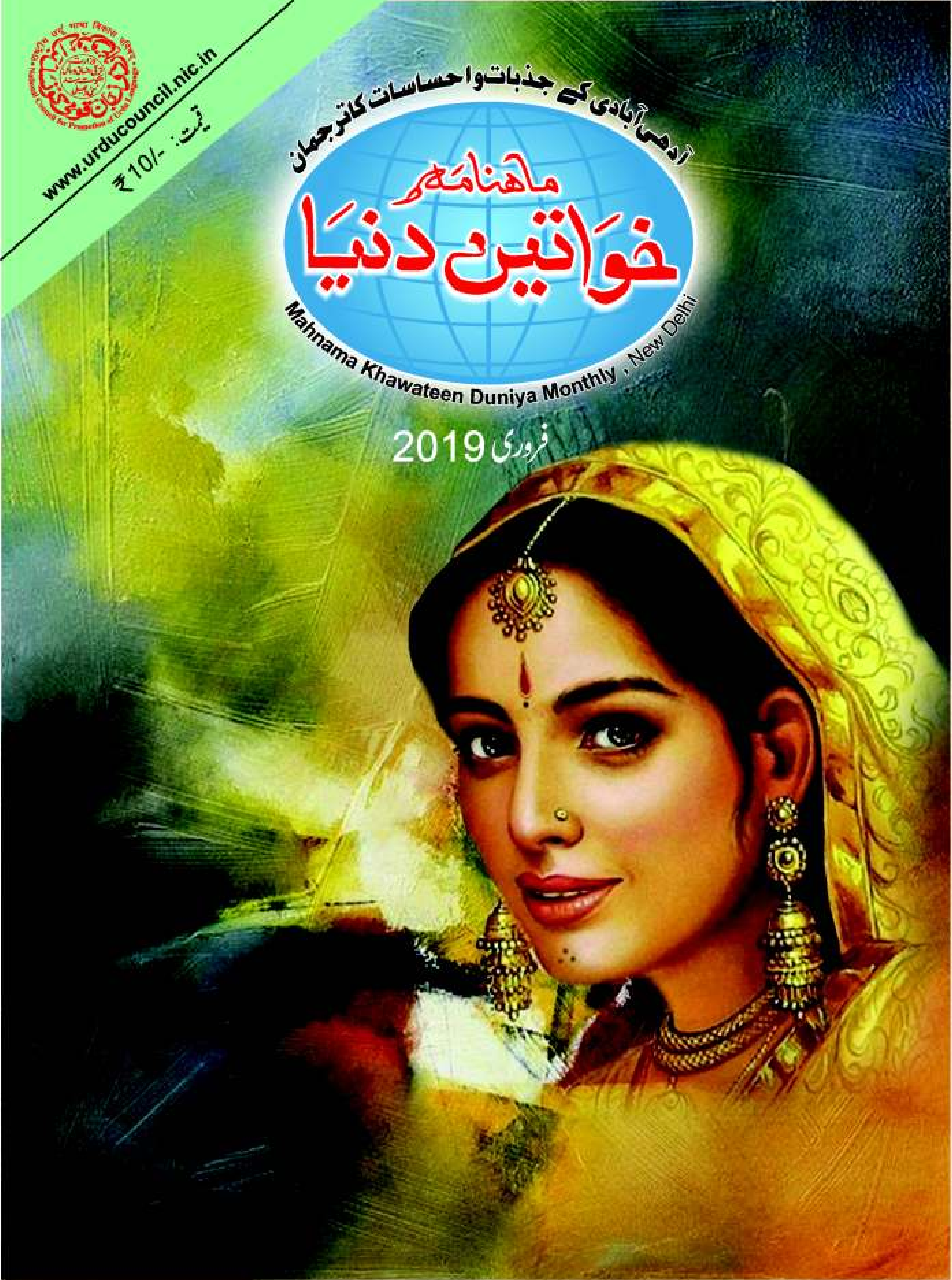

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

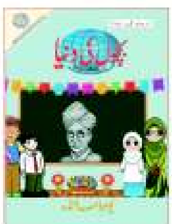

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

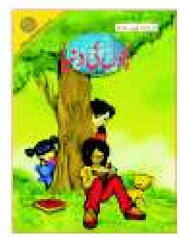

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

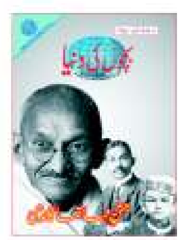

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746-011 فیکس: 26108159-011 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 2 فروری 2019

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	سکندر علی وجد	ڈاکٹر شاہین فاطمہ	5
	ساقی فاروقی کی نظم نگاری: 'زندہ پانی سچا'......	حمیرا عالیہ	8
	ڈاکٹر رشید جہاں حیات اور خدمات	چودھری امتیاز احمد	12
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		15
جہان نسواں	مسلم خواتین کے تعلیمی و عائلی مسائل	خواجہ عبدالمنتقم	16
	اردو تحقیق کے مسائل اور حل	نغمہ تبسم	18
	اردو داستانوں میں نسوانی منفی کردار کی فعالیت	رئیس فاطمہ	23
	ٹیگور، اقبال اور انسان دوستی	ثمرین	28
کہانیاں	ماں	مسرور جہاں	33
	گول گپے والا	شاہین زیدی	36
	نئی سائیکل	ڈاکٹر رضوانہ پروین	40
	انتظار	ادا فاطمہ	43
	ہم تیری منزل نہ تھے	روبینہ ساگر روبی	47
حسن سخن	ممتاز مرزا، کشور ناہید، نوشی گیلانی، شہناز فاطمہ صدیقی، ڈاکٹر رونق جہاں زیدی		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	صحت خواتین سے متعلق رہنما اصول	ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی	56
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	نگر نگر سے		60
خواتین خبر نامہ			61

مشعل

موجودہ دور میں جہاں خواتین سے متعلق بہت سے مسئلے حل ہوئے ہیں وہیں کچھ مسائل ایسے بھی سامنے آئے ہیں جن پر ابھی تک نہ تو کوئی بحث ہوئی ہے اور نہ ہی ان کا تدارک کسی نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور تبدیلی زندگی کے لیے ضروری بھی ہے۔ موجودہ منظر نامے پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ جہاں ایک طرف خواتین بہت پر عزم ہوئی ہیں، وہیں دوسری طرف وہ پسماندگی اور ذہنی کرب سے بھی دوچار ہیں۔ عورت کی حالت ہمارے معاشرے میں لمحہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔

'خواتین دنیا' کے ذریعے ہم آہستہ روی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعے ہم نے کوشش کی ہے کہ وہ خواتین جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھیں، انھیں اردو حلقوں سے روشناس کرایا جائے۔ خواتین کی ترقی ہمارے معاشرے کے لیے بے حد ضروری ہے دنیا کی ترقی کا تصور ہم ان کو حاشیے پر رکھ کر نہیں کر سکتے۔ مردوں کی بالادستی کی وجہ سے خواتین نے بہت اذیتیں برداشت کی ہیں۔ آج خواتین بھی میدانوں میں مردوں سے آگے نہیں تو ان کے شانہ بہ شانہ ضرور کھڑی ہیں۔

عورت کے وجود کو نظر انداز کر کے ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عورت بھی معاشرے کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ مرد اور ایک صالح اور ترقی یافتہ معاشرے میں دونوں کی حصہ داری ضروری ہے۔ خواتین اب اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنے لگی ہیں اور اپنے وجود کے تئیں نہ صرف بیدار نظر آ رہی ہیں بلکہ اپنے راستے بھی خود متعین کرنے لگی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ خواتین نے اپنے دم پر بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ ان کے کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ تانیثی تحریک کے باوجود آج بھی ہمارے معاشرے کی خواتین جبر و استحصال کا شکار نظر آتی ہیں۔ انھیں بنیادی حقوق تک حاصل نہیں ہیں۔ تعلیم کے زیور سے ہماری خواتین کو محروم رکھا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے نے عورتوں کو ان تمام حقوق سے محروم کر دیا ہے جو انھیں حاصل ہونے چاہیے تھے۔ خواتین کے ساتھ نابرابری کی ایک بڑی وجہ صنفی تفریق بھی ہے۔ اس تفریق سے سب سے زیادہ نقصان عورت کو ہوا ہے۔ عورت کی آزادی کو ابھی تک ہمارے معاشرے نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس موضوع پر کافی بحثیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ ہر عہد میں قانونی تبدیلی کی وجہ سے ہمارے اصول و قوانین بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ خواتین کو ان سے بھی واقف ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ آج دستورِ ہند میں خواتین پر ہو رہے ظلم و جبر کے خلاف کچھ قوانین عورتوں کے لیے بھی مخصوص کیے گئے ہیں جن کا استعمال وہ وقت آنے پر اپنے لیے کر سکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری خواتین آگے آئیں اور اپنے لیے ایسے راستوں کا انتخاب کریں جو ان کے لیے کارآمد ہو سکیں اور ان کو زندگی میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اپنے تشخص کی لڑائی کے لیے ان کو عملی طور پر متحرک ہونا ہوگا۔ خواتین سے ہم یہ گزارش کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے مسائل، اپنے راستے میں حائل دشواریوں، نابرابری، صنفی تفریق جیسے مسئلوں کا حل ڈھونڈھنے کی کوشش کریں اور ان کو تحریری شکل دیں تا کہ ان سے ہماری دوسری خواتین بھی واقف ہو سکیں۔

اردو زبان کے فروغ میں خواتین کا اہم حصہ رہا ہے۔ 'خواتین دنیا' کے ذریعے یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ خواتین آج کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر مضامین قلمبند کریں تا کہ اس رسالے سے خواتین زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں۔ خواتین دنیا کے ذریعے ہم نے خواتین کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرانے کی کوشش کی ہے جہاں وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہیں۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہماری خواتین بیدار ہو سکیں اور مثبت سوچ کے ساتھ زندگی میں آگے بڑھیں۔ 'خواتین دنیا' آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اپنے تاثرات ہمیں ضرور بھیجیں تا کہ آئندہ شمارے میں ان پہلوؤں پر غور کیا جا سکے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر شاہین فاطمہ

سکندر علی وجد

سکندر علی وجد دکنی تہذیب و روایت کے آخری امین مانے جاتے ہیں۔ وجد 22 جنوری 1914 کو ویجاپور تعلقہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور 16 / مئی 1983 کو وفات پائی۔ وجد کے والد مہر دادا پٹیل سروالا کے پولیس پٹیل تھے۔ وجد کی ابتدائی تعلیم ویجاپور میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ اورنگ آباد آگئے۔ اس درمیان کچھ روز جالنہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔

اورنگ آباد سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کیا اور ایم۔اے سال اوّل میں داخلہ لیا۔ لیکن (H.C.S.) حیدرآباد سِول سروس میں منتقل ہونے کی وجہ سے ایم۔اے نہ کرسکے۔ سِول سروس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد کچھ دن سیتاپور میں خدمات انجام دی۔ یہاں انھیں لکھنوی جیسے استادِ فن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

وجد اُس وقت تک بحیثیت شاعر ہندوستان بھر میں مشہور ہو چکے تھے۔ اور ان کی شاعری اور ترنم نے ہندوستان بھر میں انھیں ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے متعارف کروادیا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ 'بیاضِ مریم' ہے۔

سیتاپور میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد وجد حیدرآباد کے مختلف مقامات پر جج اور سیشن جج کی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1964 میں ممبئی سے وظیفۂ حسن خدمات حاصل کیا اور اورنگ آباد آگئے اور اپنے آخری لمحات تک اورنگ آباد ہی میں رہے۔

سکندر علی وجد کی غزل کا لہجہ نشاطیہ ہے۔ ان کی غزلیں رواں دواں بحروں میں ہوتی ہیں۔ وہ غزل میں غنائیت کے قائل ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلیں اپنے نشاطیہ لب و لہجہ اور شعری حسن و غنائیت کی وجہ سے اپنی الگ پہچان بناتی ہیں۔

رشید حسن خاں انھیں دکنی روایت کا آخری امین قرار دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وجد کی شاعری میں ارضیت، غنائیت، کیف و نشاط اور اسی قسم کی دوسری وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو دکنی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ وجد کی غزل میں کیف و سرور کی فضا حاوی رہتی ہے۔ مثلاً:

جن کی آنکھوں میں تھا سرورِ غزل
اُن غزالوں کی یاد آتی ہے
ذرا مسکرایا تو ساقی سنبھل کے
کئی ہاتھ کانپیں کئی جام چھلکے
تصرف ہے اے وجد کس گل بدن کا
مہکتے ہیں اشعار تیری غزل میں

وجد کی غزل میں غم، مایوسی اور شکوے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ زندگی کے روشن پہلو کو لیتے ہیں اور اپنی غزل کو روشن لکیروں سے تابناک بناتے ہیں۔ وجد کے یہاں جتنے پیکر یا استعارے آتے ہیں اُن سبھی کا تعلق روشنی، خوشبو اور نغمے سے ہوتا ہے:

خیالِ گلبدن ہے اور میں ہوں
بہارِ دل شکن ہے اور میں ہوں
یہ بلند آسمان پہ چاند تارے
سہانی انجمن ہے اور میں ہوں

وجد نے جس دور میں شاعری شروع کی وہ دور ہندوستان کی جدو جہد آزادی سے عبارت ہے۔ ایک حساس فنکار کی طرح وہ بھی اس

جدوجہد سے متاثر ہوئے۔ ان کی ہمدردی آزادی کے لیے جانیں قربان کرنے والوں کے ساتھ تھی۔ وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے عملی طور پر اس جدوجہد میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کی شاعری میں اس جدوجہد کا عکس چھلکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غزل کے الگ مخصوص مزاج کی وجہ سے وہ اشاروں، کنایوں میں اپنی بات کہتے ہیں:

عروسِ سخن یہ اشاروں کے دن ہے

نہ چھیڑ اے رونقِ شامِ غریباں
غمِ صبحِ وطن ہے اور میں ہوں
بزمِ تاریک وطن کو روشنی درکار ہے
شمع کے مانند جلنے کا زمانہ آگیا

وجد دراصل کلاسیکی مزاج کے جمالیاتی شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں بھی انہی خصوصیات سے اپنی قوت حاصل کرتی ہیں۔ دکنی شاعری کے اثر سے اُن کی غزلوں میں تخیل سے زیادہ ارضیت نمایاں نظر آتی ہے۔ وجد کی غزل کسی گہرے جذباتی تجربے کا اظہار نہیں کرتی۔ وہ اظہارِ ذات سے اخفائے ذات کے قائل ہیں اور شاید اسی وجہ سے اُن کے ہم عصر شعرا مجاز و مخدوم کے ہاں یہ گہرائی نظر آتی ہے۔ جذبے کی کمی کو وجد مترنم لفظوں، خوبصورت پیکر تراشی اور ایک دل خوش کن فضا سے چھپا لیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں ایک قسم کا بانکپن اور سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ سرمستی بھی اپنی حدوں ہی میں رہتی ہے۔ وہ کبھی والہانہ اظہار نہیں کرتی اور شاید انھیں خود بھی اپنے غزل کے اس مزاج کا اندازہ ہے:

ہمیشہ دل نشین رہے میرے آنسو
نہ پلکوں پہ آئیں نہ آنکھوں سے چھلکے
بات دل کی زبان تک نہ آئی
رہ گئی حسرتِ لب کشائی

وجد کے اس مزاج کی ایک وجہ کلاسیکیت سے ان کی وابستگی ہے اور دوسری وجہ شاید اُن کا سماجی رتبہ بھی ہے جو انھیں پوری طرح سے کھل کر حالِ دل بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زویہ انصاری وجد کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاعر اور اس کی شاعری کو ہم آخر کیسے سمجھیں شخصیت اور فن دونوں کو جوڑ کر یا دونوں کو جدا کر کے یا محض شعری رویے کی روشنی میں۔''

وجد کے اکثر نقادوں کو اُن کی شاعری ہی نہیں بلکہ اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں بھی یہی مشکل پیش آتی ہے۔ دراصل وجد کے یہاں جذبات و احساسات کی ایک تہذیب ملتی ہے۔ وہ اُنھیں کچھ حدود میں آزادی دیتے ہیں۔ بے محابہ اظہار اُن کے یہاں اس لیے نہیں ملتا کہ ہماری تہذیب اُسے برا سمجھتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ وجد ان تمام پابندیوں کو عائد کرنے کے بعد بھی اپنے فنی رویے، لفظوں کی دروبست اور دلکش فضاء بندی کی وجہ سے متاثر کن اشعار کہنے پر قادر ہیں۔ وجد کی غزل سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس میں قاری یا سامع کو جذباتی طور پر اپنے ساتھ بہالے جانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن یہ توقع ضرور کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے اور سننے والے کو ایک خوبصورت فضا اور ذہنی سکون و انبساط فراہم کرتے ہیں اور وجد کی غزل اس توقع میں ہر اعتبار سے پوری اترتی ہے اور اسی وجہ سے اُن کے نقاد ان کی غزل کے معترف ہیں:

''وجد بہترین استعارے تراشتے ہیں جو روشن اور متحرک نظر آتے ہیں اور ان کے اثر سے پوری نظم/غزل متحرک منظر بن جاتی ہے۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ وجد کی غزلیں اپنے حسن و جمال کی وجہ سے ایک الگ فضا بنا لیتی ہیں۔ جس کا اعتراف ان کے ہر نقاد نے کیا ہے:

یادوں سے چراغاں ہیں شبستانِ سخن میں
اے حُسن تیرے نقش وقدم یاد رہیں گے

اور یہ نقش وقدم وجد کی ہر غزل میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں وجد کے پاس کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ وجد نے ان میں سے کچھ پر عنوانات دے دیے ہیں۔

اُس کے باوجود انھیں نظم نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ یہ تمام اشعار اپنی ہیئت، فضاء بندی، لفظیات اور اندازِ اظہار کے اعتبار سے غزل ہی کے زمرے میں آتی ہے۔

بقول وحید اختر:

"ان کی بیشتر غزلیں نور کے تسلسل اور خیالوں، تاثر کی حدت کے لحاظ سے نامیاتی کل کی طرح ہیں۔ "عالم آشوب"، "مبشارت"، "شاعر کے کھیل" ایسی نظمیں ہیں جو غزل کے قالب میں وحدتِ خیال واحساس کے نمونے مانی جاسکتی ہیں۔"

وجد کی یہ نظمیں جو دراصل غزلیں ہیں۔ اپنے اندر ایک خاص فضاء رکھتی ہیں۔ ان میں خیال کا ایک تسلسل ملتا ہے۔ اس کے باوجود ہر شعر ایک اکائی کی طرح بھی پڑھا اور سنا جاسکتا ہے۔ ان اشعار میں بھی اُن کی دوسری غزلوں کی طرح خوبصورت فضا بندی اور نشاطیہ لہجہ نمایاں ہے:

دیارِ حسن سے سیرو شباب لایا ہوں
نظر بلند و دل کامیاب لایا ہوں
بڑی جتن سے محبت بھری نگاہوں میں
حریم ناز کے رنگین خواب لایا ہوں

یہ اور اس قسم کے کئی اشعار وجد کے نظریۂ فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں رجائیت، مسرت، آفرینی اور بانکپن کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری انبساط و مسرت فراہم کرنے کا ذریعہ ہے اور وہ اس نظریے پر ہر اعتبار سے کھرے اترتے ہیں:

ہمت کی چراغوں سے روشن
ہر راہ گزر ہوجاتی ہے
پُر عزم نگاہیں راہ رواں
سامان سفر ہوجاتی ہے

سحر کا ذکر اندھیرے کی بات ہی نہ ہوئی
وہ آئے جب سے میرے گھر میں رات نہ ہوئی
ماہ نو ڈوب گیا، ماہِ تمام آتا ہے
دست ساقی سے، میرے ہاتھ میں جام آتا ہے

وجد ان گنے چنے شعراء میں ہیں جو اپنی غزل میں تاثر پیدا کرنے کے لیے اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ ایک طربیہ فضا پیدا کرتے ہوئے اپنے پڑھنے والوں کو مطمئن اور آسودہ کرتے ہیں۔

وجد کا لہجہ، انداز بیان اور لفظیات کے علاوہ موضوعات بھی ان کے دور کے غالب رجحان سے مختلف ہیں۔ وہ اپنے دور کی شاعری کے عام راستے پر چلنے کی بجائے اپنے لیے الگ راستہ منتخب کرتے ہیں اور اس راستے پر اپنے نقش قدم اس طرح ثبت کرتے ہیں کہ لوگ بہر حال اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہی وجد کی انفرادیت ہے۔□□□

Dr. Shaheen Fatema
Basheer Colony, Roshan Gate
Aurangabad-431 001 (M.S)

نوٹ

'خواتین دنیا' میں خواتین سے متعلق سیاسی، سماجی معاشی اور ادبی تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ قلمکاروں سے گزارش ہے کہ وہ ان تمام موضوعات کو ذہن میں رکھ کر مضامین تحریر کریں۔

حمیرا عالیہ

ساقی فاروقی کی نظم نگاری

’زندہ پانی سچا‘ کے حوالے سے

اردو ادب میں جدید شاعری کا ذکر ساقی فاروقی کے بغیر نامکمل ہے۔ ساقی کی شاعری کی تفہیم اس لیے بھی مشکل ہے کہ ان کی نظموں کی تہہ داری اور ایمائیت نے انھیں ایک مخصوص طبقے تک محدود کردیا۔ ساقی علامتی اور تجریدی نظم نگاری کے ایک بہت ہی اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا آہنگ اپنے عہد اور پیش روؤں سے حد درجہ مختلف ہے۔ ان کا اسلوب ،لفظیات اور عروضی نظام جدید حسیت سے آشنا ہے۔ ان کی شاعری میں کئی جہات ہیں۔ انھوں نے انفرادیت کے نام پر صرف نئی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی تشکیل کے لیے ایک ایسا لب ولہجہ اپنایا جس نے انھیں اپنے ہم عصروں میں انفرادیت بخشی۔

ساقی نے 1936 میں ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے گورکھپور شہر میں آنکھیں کھولیں۔ ابھی ساقی محض 12 سال کے تھے کہ ان کے خاندان نے مشرقی پاکستان ہجرت کرلی۔ یہاں وہ ذہنی طور پر بہت پریشان رہے اور ایک بار پھر انھیں ہجرت کی تکلیف سے گذرنا پڑا اور وہ پاکستان آگئے۔ ان کے خاندان نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ساقی نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ 1963 میں ساقی نے پاکستان بھی چھوڑ دیا اور انگلینڈ کو اپنا مسکن بنالیا۔ یکے بعد دیگرے ہونے والی ہجرتوں نے ساقی کو ذہنی طور پر منتشر کردیا تھا اور اس بے سکونی اور انتشار کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ دو متضاد ذہنی کیفیتوں کے ساتھ جی رہے تھے۔ ان کا دل اگر مشرق تھا تو ذہن مغرب اور دونوں تہذیبوں کے تصادم نے ان کی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ یہ جدید کاری جوان کا مخصوص رنگ ہے یہ اسی تہذیبی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ’’زندہ پانی سچا‘‘ کی پہلی نظم ’’سرخ گلاب اور بدر منیر‘‘ ہجرت کے کرب کی آئینہ دار ہے۔ چونکہ شاعر جب پہلی نظم لکھتا ہے وہ اس اعتبار سے لکھتا ہے کہ وہ اس کی مکمل شاعری کا منظر نامہ تخلیق کرتی ہے۔ لہٰذا اس نظم کے ذریعے ساقی کے اندرونی کرب کی غمازی ہوتی ہے۔ وہ لہجہ جو ہجرتوں کی صعوبتوں سے وضع ہوتا ہے وہ اس نظم میں کھل کر واضح ہوتا ہے۔ یہاں خود کلامی کی وہی کیفیت ہے جو ناصر کاظمی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ایک مہاجر کا درد ان کے لفظوں میں مکمل طور پر جھلک رہا ہے:

جو زخم تھے سرخ گلاب ہوئے جو داغ تھے بدر منیر ہوئے
اس طرح سے کب تک جینا ہے میں ہار گیا اس جینے سے

ناصر عباس نیر نے ساقی کی اذیت کی تفہیم کچھ اس طرح سے کی ہے:

’’اپنے وطن میں رہنا ایک طرح سے وصل کے تجربے کی مانند ہے جس میں مرگ آرزو واقع ہوتی ہے، جب کہ وطن سے دوری فراق کی طرح ہے جو محبوب یعنی وطن کی طرف پلٹنے نیز اسے اپنے تخیل میں زندہ رکھنے کی آرزو کو باقی رکھتی ہے۔ بایں ہمہ وطن کو وطن سے دور رہ کر یاد کرنا اور اس دوری میں وطن کو دریافت کرنا، جذبات کی سطح پر خاصا تکلف دہ عمل ہے۔ یہ تکلیف ساقی کی شاعری میں بھی سرایت کرگئی ہے‘‘

(’’جان محمد خان، سفر آسان نہیں‘‘: ساقی فاروقی کی یاد میں۔از: ناصر عباس نیر۔ مشمولہ استفسار، شمارہ 16-17)

لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں شکست خوردگی کا احساس نہیں پایا جاتا۔ وہ نئے خواب دیکھنے سے نہیں ڈرتے اور نئے سفر پر چلنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ بے راہ رویوں کی ایک دوسری دنیا جو مغرب میں آباد ہے وہ ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ رشتوں کا اعتبار اور تقدس ختم ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ جو ایک جنس کے تضاد کی کیفیت ہے وہ بنی ہوئی ہے کہ کوئی ہو جو ان کی فکر کرے اور انھیں اس دشت تنہائی میں اپنی ہمراہی کا سائبان بخشے:

سنو تنہا چلنا کھیل نہیں چلو آؤ میرے ہمراہ چلو
چلو نئے سفر پر چلتے ہیں چلو مجھے بنا کے گواہ چلو

ساقی مزاجاً انا پرست تھے۔ خود کو منفرد سمجھنے کی عادت نے ان کے وجود کے گرد ایک نامحسوس حصار کھینچ دیا تھا جس کو پار کرنے کی جرأت بہت کم لوگوں نے کی۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج کی شدت پسندی نے بھی انھیں عام شاعروں کی بھیڑ سے الگ رکھا۔ مغربی تہذیب کی آزادروی اور بغاوت کا جو انداز ہمیں ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس میں ان کے ذاتی حالات کو بھی کسی قدر دخل ہے کہ کبھی کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ فطری طور پر لہجے میں ایک ضدسی پیدا ہو جاتی ہے۔ جنس کا تذکرہ وہ شاعرانہ تجربے کے طور پر کرتے ہیں اور اس کے اظہار میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ اس بات کو لے کر ان پر فحش نگاری کا الزام بھی لگایا گیا لیکن ساقی نے اس پر کبھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ گردوپیش کے حالات سے گھٹن محسوس کرتے ہیں تو تیکھے الفاظ کے ذریعے برملا اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اسی گھٹن کی وجہ سے کہیں کہیں ان کا لہجہ طنزیہ بھی ہو جاتا ہے۔

ساقی ساحر تھے۔ انھوں نے الفاظ کے ذریعے طلسم تیار کیا تھا۔ اس طلسم میں آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے ساتھ ساتھ لہراتے سائے، خوفناک سانپ اور چار کہنیوں والی مخلوق بھی ہے۔ اس طلسم میں باکرہ اور بیسوا

> **’’ساقی کا استعاراتی نظام بہت طاقتور ہے۔ان کی نظموں کا منظر نامہ انھی بنیادی استعاروں سے عبارت ہے جن سے ساقی کے آہنگ کی تشکیل ہوئی ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف جانوروں کے استعارے سے منظرنامے میں انفرادیت پیدا کی۔ان کے یہاں حشرات، نباتات اور حیوانات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔کتے ،بلی، خرگوش اور مینڈک وغیرہ کا استعمال وہ اتنی آسانی سے کرتے ہیں کہ وہ نامانوس نہیں لگتے لیکن ان کی معنوی تہہ تک پہنچنے کے لیے قاری کو سخت ذہنی ورزش کرنی پڑتی ہے‘‘**

عورتیں بھی موجود ہیں اور نرگسیت کے مارے ہوئے شیخ بھی ہیں۔ لیکن اس طلسم کے اسرار کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ساقی اپنی نظموں میں محض چاند، ستاروں، رنگوں اور خوشبوؤں کی باتیں نہیں کرتے بلکہ عصر حاضر کی کریہہ حقیقتوں کا بھیانک چہرہ دکھاتے ہیں۔ سماج کے تعفن زدہ چہرے سے جب وہ پوری بے باکی کے ساتھ پردہ اٹھاتے ہیں تو قاری کا جذباتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

ساقی کا استعاراتی نظام بہت طاقتور ہے۔ ان کی نظموں کا منظرنامہ انھی بنیادی استعاروں سے عبارت ہے جن سے ساقی کے آہنگ کی تشکیل ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف جانوروں کے استعارے سے منظرنامے میں انفرادیت پیدا کی۔ ان کے یہاں حشرات، نباتات اور حیوانات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ کتے، بلی، خرگوش اور مینڈک وغیرہ کا استعمال وہ اتنی آسانی سے کرتے ہیں کہ وہ نامانوس نہیں لگتے لیکن ان کی معنوی تہہ تک پہنچنے کے لیے قاری کو سخت ذہنی ورزش کرنی پڑتی ہے۔ ان کے استعارے بظاہر جتنے آسان نظر آتے ہیں درحقیقت ان میں اتنی ہی پیچیدگی پوشیدہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی استعاراتی جہت ان جانوروں کی اہمیت بڑھا دیتی ہے۔ انھوں نے استعاروں کے ذریعے جن کیفیات اور احساسات کو پیش کیا ہے وہ ان کی اصل انفرادیت ہے۔ ان کی نظموں میں گل وبلبل اور زلف ورخسار کے عام استعاروں کے

بجائے مگرمچھ، مینڈک، بکڑے اور سانپ نظر آتے ہیں۔ وہ ان جانوروں کے پردے میں عہد رفتہ کی خود غرضی اور سفاکی کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی ان کا منفرد انداز ہے جو ایک وسیع منظر نامے کا حامل ہے۔ شیر امداد علی کا مینڈک، ایک کتا نظم، ایک سور سے، خرگوش کی سرگزشت، خالی بورے میں زخمی بلا، بکڑا اور تتلی اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو اپنے عنوان سے ہی قاری کو چونکا دیتی ہیں۔ یہی وہ جدت طرازی ہے جو ساقی کی پہچان ہے۔ اپنے اس فنکارانہ تجربے کی بابت افتخار عارف سے گفتگو کرتے ہوئے ساقی نے کہا تھا:

"میری نظموں کے نباتات اور حیوانات میری ذات کا حصہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک فرد ان کے رشتے سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سیدھی سادی Animal poems نہیں ہیں۔ میرے جانور جارج آرول (George Orwell; b1908) کے جانوروں کی طرح انسانی یا سماجی شخصیت نہیں رکھتے یا میں (Ted Huges; b1930) کی طرح ڈی ٹیچ ہو کر ان کے بارے میں ان پر ترس کھا کر نہیں لکھ رہا۔ میں تو اس کامپلیکس عہد کے کامپلیکس مسائل کے ساتھ ان میں شامل ہوں۔" ('سرخ گلاب اور بدر منیر' ص 26-27)

ساقی کی نظموں کا ایک نمایاں رنگ ان کی تلخ حقیقت نگاری ہے۔ وہ انسانی زندگی اور اس کی بے رحم حقیقتوں کو بڑی سفاکی سے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ انھیں لفظوں کے خوبصورت پیرہن میں چھپانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کو قبول کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا بھرپور تخلیقی اظہار کرتے ہیں۔ وہ زود حس تھے۔ معاشرے کی بے اعتدالیوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے تھے اور محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے طبقاتی تضاد کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور پوری شدت پسندی سے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی نظموں کی فضا ان زہریلی حقیقتوں کے اظہار سے تشکیل پاتی ہے جو ہمارے سماج کے ناسور کہلائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے اندر کے غصے اور نفرت کو پوری تلخی سے اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

"طنز اور تمسخر اور سنجیدگی کا یہ امتزاج ٹی ایس ایلیٹ کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اس میں غصہ نفرت اور رنج کی آمیزش ساقی فاروقی کی تخیلی کشاکش کی آئینہ دار ہے۔"

(مضمون 'بیرونی ملک میں اپنا شاعر: ساقی فاروقی' از: شمس الرحمٰن فاروقی۔ مشمولہ 'زہر اب اگاتا ہے مجھے: ساقی فاروقی کی شاعری کی تفہیم و تعبیر۔ مرتب ڈاکٹر قمر صدیقی۔ ص 10)

یہ ساقی کی ایک مشہور نظم 'الکبڑے' کا ایک بند ہے۔ بظاہر یہ نظم بھکاری طبقے میں قبل از وقت پیدا ہونے والے ستوانسے بچوں کی حالت زار بیان کرتی ہے۔ وہ بچے جنھیں خود ان کے باپ ہی پیسہ کمانے کے لالچ میں ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر معذور بنا دیتے ہیں۔ زندگی کے اسٹیج پر وہ جب چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں تو ان کی خاموش چیخیں معصومیت کے قتل کی آواز بن جاتی ہیں۔ یہ معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو ہمیشہ پس منظر میں رہتا ہے۔ لیکن جب ہم نظم کے درمیان پہنچتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ساقی درپردہ کسی اور سے ہی مخاطب ہیں کہ جب مغرب کے گل زاروں میں پھول نکلتے ہیں تو بنگال اور پنجاب کے کھیت مرجھانے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے درمیان کا یہ ایک بند ساقی نے محض فطرت کی تصویر کشی کے لیے تو کہا نہیں ہوگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان بھک منگوں کے استعارے میں ان بے ایمان، بے ضمیر اور لالچی سرمایہ داروں کو مخاطب کیا ہو جو اپنے فائدے کی غرض سے ملک کی معیشت بیچ کھاتے ہیں۔ یہ نظم ساقی کی ممتاز نظموں میں شمار ہوتی ہے:

عجب زمانہ تھا
جب یوروپ کے گلزاروں میں
اکھوے پھوٹتے تھے
تب بنگال کے اور پنجاب کے
لش لش کرتے کھیتوں میں
دھان اور گندم کے خوشے
مرجھانے لگتے تھے

'زندہ پانی سچا' کی بیشتر نظموں میں ساقی کا یہی انداز ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ عشق و محبت کے لطیف جذبات کا شائبہ تک نہیں۔ ایک عجیب بیزاری کی سی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ صنف نازک کے تئیں بے یقینی صاف نظر آتی ہے۔ گویا مغرب کی زوال پذیر تہذیب کی تھکن ساقی کی روح پر طاری ہو گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں کہیں کہیں ان کے لب و لہجے میں کڑواہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ 'سی سک'، 'باکرہ' اور 'فلرٹ' اس کی عمدہ مثال ہیں۔ عورت کو ساقی نے اپنی نظموں میں بڑی بے رحمی سے پیش کیا ہے۔ روایتی ڈگر سے ہٹ کر ساقی نے جمالیات کے ایک انوکھے رخ سے متعارف کروایا ہے جہاں ایک خوف، دہشت اور کراہیت کی سی فضا پائی جاتی ہے۔ ہم عصر زمانے کی بے حسی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے مکمل

تخلیقیت کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔نشاط و سرور کے بجائے 'زندہ پانی سچا' کی نظموں میں افسردگی اور اداسی چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ساقی کے لہجے کی یہ جھنجھلاہٹ دراصل دو تہذیبوں کے تصادم سے پیدا ہوئی ہے۔وہ بیک وقت دو معاشروں کا حصہ رہے تھے ایک ان کا اپنا وطن ہندوستان اور دوسرا ان کا رہائشی مکان لندن۔اپنے وطن کی اخلاقی اور تہذیبی اقدار دیکھنے کے بعد جب وہ مغربی معاشرے کی بے راہ روی اور کھلا پن دیکھتے ہیں تو ان کے یہاں ایک جھلاہٹ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ مزاج رفتہ رفتہ ان کی ادبی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔

اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ساقی کی شاعری میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔جدید تراکیب،انوکھی تشبیہیں،استعارات، محاورات اور اشارات کے نئے پیرہن قاری کو یک بیک چونکا دیتے ہیں۔ان کے مزاج کا آہنگ ان کی شاعری پر واضح طور سے نظر آتا ہے۔ان کی نظمیں اپنے ڈکشن کو ساتھ لے کر چلتی ہیں۔پیکر تراشی میں بھی ساقی نے اپنے خلاقانہ جوہر خوب خوب دکھائے ہیں۔قدرت کی تصویر کشی میں ساقی کو ملکہ حاصل تھا۔ان کی نظموں کا جارح انداز انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔تقلید سے گریز کرتے ہوئے ساقی نے اپنی ایک الگ راہ قائم کی اور اردو نظم کو روایتی زنجیروں سے آزاد کروا کر جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت کے ساتھ چلنے کا حوصلہ عطا کیا۔ پکنک، پارٹی، کینسر اور بس اسٹاپ جیسی نظمیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ان کی نظموں کی فضا آگ،خون،برف،تباہی،موت،لاش اور نادیدہ شعلوں سے تخلیق ہوئی ہے۔سکون اور اطمینان کے لمحوں کے بجائے وحشت اور خوف کے سائے 'زندہ پانی سچا' کے صفحات پر لہراتے نظر آتے ہیں:

چوک چاک
خامشی کھڑی ہوئی
جس کے بند کان میں
ایک سبز خوف کے
سرخ زہر میں بجھی
زرد زرد بالیاں پڑی ہوئی
خون پوش راستے
راستوں میں سولیاں گڑی ہوئی (سوگ نگر 1982)

'زندہ پانی سچا' کے علاوہ بھی ساقی کئی اہم تصانیف کے مالک ہیں۔ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'پیاس کا صحرا' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس کے علاوہ 'بہرام کی واپسی'، 'حاجی بھائی پانی والا'، 'بازگشت و بازیافت' اور 'رازوں سے بھرا بستہ' ان کے دیگر مجموعے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری کا پچاس سالہ انتخاب 'سرخ گلاب اور بدر منیر' کے نام سے شائع کیا۔ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ Storm dark nailing کے نام سے طبع ہوا۔ساقی نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ وہ ایک بہترین نقاد بھی تھے۔ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ہدایت نامہ شاعر' کے نام سے منظر عام پر آیا۔انھوں نے فکشن کے میدان میں بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنی خودنوشت ''آپ بیتی پاپ بیتی'' کے نام سے لکھی اور اس میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ کر دیا۔

دنیا کے دستور کے مطابق ساقی کے مخالفین کی تعداد بھی بے شمار تھی جنھوں نے ان کی تجریدی نظموں کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ساقی کو مخالفت کی قطعی پروانہ تھی۔وہ جہاں بھی گئے اپنی جدت طرازی اور منفرد شاعری کی چھاپ قائم کرتے گئے۔وہ نقش قدم پر چلنے والوں میں سے نہیں تھے وہ راہ قائم کرنے والوں میں سے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم کے ساتھ ساتھ اردو غزل کو بھی جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا۔▢▢▢

Humaira Alia
Nadwa Campus,Taigore Marg
Post Box 93
Lucknow-226007 (U.P)

چودھری امتیاز احمد

ڈاکٹر رشید جہاں

حیات اور ادبی خدمات

علی گڑھ تحریک میں شریک ہونے والے عالموں میں شیخ عبداللہ کا نام سرفہرست ہے۔ شیخ صاحب کے مسلم قوم پر جو بیش بہا احسانات ہیں اس سے علی گڑھ تحریک کا کوئی طالب علم انکار نہیں کرسکتا۔ شیخ عبداللہ اپنے عہد کے مشہور سماجی کارکن مصلح اور ماہر تعلیم تھے۔ علی گڑھ میں مسلم گرلز اسکول اور ویمنس کالج کی بنیاد ڈال کر انھوں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اس علم وادب کے گہوارے میں 25 اگست 1905 میں رشید جہاں نے آنکھ کھولی۔ اتفاقاً رشید جہاں کے والدین کو تعلیم نسواں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس تعلق سے رشید جہاں کو خوش بخت ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ رشید جہاں کی والدہ وحید جہاں بیگم جو اعلیٰ بی کے نام سے مشہور تھیں تعلیم نسواں کی بہت بڑی حامی تھیں انھوں نے گرلز اسکول کی تاسیس میں اپنے شوہر کی خوب ہمت افزائی کی یہاں تک کہ انھوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر اسکول بورڈنگ میں رہائش اختیار کی۔ تاکہ وہ خود وہاں کی نگرانی کرسکیں اور ان کی موجودگی سے ان ماؤں کو بھی تقویت ملے جن کی لڑکیاں وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مقیم تھیں۔

رشید جہاں کی ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں ہوئی جو ان کی پیدائش کے ایک سال بعد 1906 میں قائم ہوا تھا۔ رشید جہاں نے اپنے گھر کے ماحول کے متعلق خود کہا تھا کہ ''ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تو ہمارا تعلیم نسواں کا اوڑھنا ہے اور تعلیم نسواں کا بچھونا ہے'' رشید جہاں نے 1922 میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھوں نے ازبیلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں انٹرمیڈیٹ سائنس میں داخلہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کی تعلیم بہت محدود تھی لیکن شیخ عبداللہ نے اپنی بیٹی کو محض علم سیکھنے کی خاطر علی گڑھ سے لکھنؤ بھیج دیا۔ رشید جہاں بچپن سے ہی ایک شرارتی اور ذہین طالبہ تھیں۔ ان کو ادبیات سے گہرا تعلق تھا بلکہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اٹھارہ برس کی عمر میں جب وہ انٹرمیڈیٹ میں تھیں تو انھوں نے معاشرتی موضوع پر ایک انگریزی کہانی ''The Tom Tom Beats'' اپنے کالج میگزین کے لیے 1922 میں لکھی تھی۔ جس کو آل احمد سرور نے اردو میں ''سلمیٰ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ وہ لکھنؤ کے زمانہ تعلیم میں ہی ملک کے حالات کو سمجھنے لگی تھیں اور گاندھی جی کے نظریات سے متاثر ہوئی تھیں چنانچہ تخلیقی طور پر انھوں نے انٹر میں افسانے لکھنے تو دہلی آکر میڈیکل کالج کی طالبہ ہونے کے باوجود ڈراموں میں بھی دلچسپی لی۔

لیڈی ہارڈنگ کالج کے دوران تعلیم انھوں نے ایک ڈرامے میں ہدایت بھی دی جو کافی مقبول ہوا۔ اس طرح میڈیکل کالج میں تعلیم کے ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ 1929 میں انھوں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی جس کے بعد وہ یوپی میڈیکل سروسز کے لیے منتخب کرلی گئیں۔ ان کا پہلا تقرر کانپور میں ہوا۔ بعدازاں وہ بلندشہر اور لکھنؤ میں بھی تعینات کی گئیں۔

1931 میں لکھنؤ کی تقرری کے دوران ان کی ملاقات سجاد ظہیر، احمد علی اور محمود الظفر سے ہوئی۔ یہ لوگ اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ نومبر 1932 میں ان نوجوان ادیبوں کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے''

لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس میں رشید جہاں کی دو تخلیقات ''پردے کے پیچھے'' اور ''دلی کی سیر'' شامل تھیں۔ اس مجموعے میں شامل تخلیقات انقلابی اور غیر روایتی انداز لیے ہوئے تھیں جس کا عوامی سطح پر نہایت ہی شدید رد عمل ہوا اور حکومت نے مجموعہ ضبط کر لیا۔

سجاد ظہیر، احمد علی، محمود الظفر اور لکھنؤ کے دوسرے ہم خیال لوگوں سے رابطے کے باعث رشید جہاں کو مارکسزم اور کمیونسٹ پارٹی کو سمجھنے کا موقع ملا۔ لہٰذا اکتوبر 1934 کو انھوں نے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی دوران محمود الظفر اور رشید جہاں کے تعلقات بڑھنے لگے۔ 4 اکتوبر 1934 کو ایک سادہ سی تقریب میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس زمانے میں محمود الظفر ایم اے او کالج امرتسر میں وائس پرنسپل تھے اور رشید جہاں بہرائچ میں ایک ہسپتال میں ڈاکٹر تھیں۔ شادی کے بعد رشید جہاں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور امرتسر چلی آئیں اور نجی طور پر میڈیکل پریکٹس شروع کر دی۔ بظاہر یہ معمولی بات ہے مگر رشید جہاں جیسی روشن خیال لڑکی کے لیے نوکری سے مستعفی ہونا ان کی شخصیت کے ایک خاص پہلو کو سامنے لاتا ہے کہ محض شوہر کی دلداری اور خوشی کے لیے وہ اتنے اہم منصب سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہیں۔ ہاجرہ بیگم ان یادگار لمحوں کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''1934 سے 1936 تک امرتسر کے قیام کا عرصہ رشید جہاں کے فنی اور تخلیقی شعور کے ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امرتسر کے جس کالج کے محمود الظفر وائس پرنسپل ہو کر رہ گئے اسی کالج کے پرنسپل محمد دین تاثیر تھے۔ جن کی سیاسی، ادبی اور تنقیدی لیاقت کا لوہا ہندوستان کیا ولایت کے طلبا بھی مانتے تھے۔ اس کے علاوہ امرتسر میں فیض احمد فیض محب الحسن قاضی فرید اور کئی نئے لکھنے والے تھے ساتھ ہی لاہور میں میاں افتخار الدین اور ان کے اردگرد مارکسٹ خیالات کے نوجوانوں کا گروہ تھا۔ اردو کے کئی چوٹی کے ادیب نامہ نگار اور شعرا تھے۔ امرتسر لاہور میں روز کی ادبی محفلیں ہوتی تھیں، بحثیں ہوتی تھیں اور تیکھی تنقید ہوتی تھی۔ ان سب نے رشیدہ کی علمی دانست کو وسیع اور اردو ادب سے واقفیت کو ہمہ گیر بنانے میں مدد دی۔''

وہ افسانے لکھتی رہیں اور ان کی مانگ ہوتی رہی 1937 میں لاہور سے ''عورت اور دوسرے افسانے'' کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ 1936 میں ظہیر کے واپس آنے پر جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع ہوئی تو رشید جہاں نے پورے انہماک سے اس میں حصہ لیا۔

1936 میں محمود نے امرتسر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن محمود فوراً اپنے ارادہ پر عمل نہ کر سکے کیونکہ رشید جہاں کی علالت کی وجہ سے انھیں یورپ جانا پڑا۔

1937 میں لندن سے واپسی پر محمود اور رشید جہاں دہرہ دون میں محمود کے والدین کے ساتھ رہنے لگے۔ 1937 سے 1942 تک کا عرصہ رشید جہاں کی شخصیت اور ان کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو عروج پر لانے میں مددگار ثابت ہوا۔

امرتسر میں رہتے ہوئے نظریاتی طور پر رشید جہاں نے اشتراکیت کے اصولوں کو اپنا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی غریب محنت کش عوام کی زندگی کا تجربہ ان کی طبی سرگرمیوں تک محدود تھا۔ وہ مزدور کو ایک مریض کی حیثیت سے جانتی تھیں۔ ساتھ لڑنے والے رفیق کی طرح نہیں۔ مارکسزم کے اصولوں کو انھوں نے پڑھا تو تھا لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے کا انھیں موقع نہیں ملا تھا۔ ان کی اپنی شخصی زندگی علیحدہ تھی اور سیاسی سرگرمیاں الگ۔

رشید جہاں سچی خاتون تھیں تصنع بناوٹ یا نمائش کی خاطر کوئی کام نہ کرتیں بلکہ جن لوگوں میں کام کے تئیں انہماک یا سنجیدگی نہ پاتیں ان کی سرزنش کرنے میں تکلف سے کام نہ لیتیں۔

رشید جہاں کچھ عرصہ جیل میں رہیں۔ وہ جیل میں بھی نہ صرف اپنے ساتھیوں کا خیال رکھتیں بلکہ سپاہیوں اور ان کے افراد خانہ کا علاج بھی کرتیں۔ وہ جتنے دن بھی قید میں رہیں وہاں تعمیری کاموں میں مصروف رہیں۔ مثلاً پڑھنے لکھنے، کھانا پکانے نیز سلائی صفائی اور باغبانی کی تربیت۔ ہندوستانی تہواروں کو ایک ساتھ منانے کا خیال بھی رشید جہاں کا ہی تھا۔ وہ بھوک ہڑتال بھی کرتیں۔ ایک بار تو بھوک ہڑتال کی مدت چودہ پندرہ دن تک جاری رہی۔ دراصل یہی وہ وقت تھا جب رشید جہاں کو بیماری نے اپنی گرفت میں لیا۔ اگرچہ وہ 1937 میں اپنے گلے کے غدود کے علاج کے لیے باہر جا چکی تھیں جس سے کافی افاقہ بھی ہوا تھا مگر مسلسل کام، انتھک مصروفیات نیز جیل کی زندگی میں کھانے پینے میں بدنظمی نے انھیں کمزور کر دیا تھا۔ رشید جہاں اپنی بیماری کا ذکر کسی سے کرنا پسند نہیں کرتی تھیں البتہ ہاجرہ بیگم کو انھوں نے جیل میں ہی بتایا تھا کہ وہ کئی خطرناک بیماریوں کا شکار ہیں لیکن چونکہ وہ ایک مضبوط قوت ارادی اور بلند حوصلے کی خاتون تھیں اس لیے وہ ان بیماریوں کو جھیلتی رہیں مگر 1950 میں ان کی بیماری سرطان کی شکل میں سامنے آئی جس کا فوری طور پر آپریشن کیا گیا

جس کے بعد کافی حد تک وہ ٹھیک بھی ہوگئیں تھیں لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے احتیاط، آرام اور پرہیز نیز ڈاکٹر کی ہدایت پر توجہ نہیں دے پاتی تھیں چنانچہ ڈیڑھ سال بعد یعنی مارچ 1952 میں بیماری پھر عود کر آئی۔ ہندوستان کے ڈاکٹروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کرکے ماسکو میں علاج کا مشورہ دیا حالانکہ رشید جہاں خود ڈاکٹر تھیں اور انھیں معلوم تھا کہ ماسکو میں بھی کچھ نہیں ہوسکتا یہ لاعلاج مرض ہے لیکن اپنے شوہر محمود الظفر کی خوشی کے لیے وہ ماسکو جانے کے لیے راضی ہوگئیں۔ تمام تر صعوبتوں کے بعد جب یہ لوگ ماسکو پہنچے تو وہاں بھی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا آخرکار ماسکو میں تین ہفتے کے قیام کے بعد 29 جولائی 1952 کو ان کا انتقال ہو گیا، انتقال کے وقت ان کی عمر 47 سال اور 11 ماہ تھی۔

ڈاکٹر رشید جہاں ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے جانی جاتی ہیں وہ افسانہ نگار ڈراما نویس، مضمون نگار اور اچھی مدیر تو تھیں علاوہ ازیں وہ ایک سیاسی اور سماجی کارکن بھی تھیں۔

رشید جہاں کے کل تین افسانوی مجموعے ہیں سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ''عورت اور دیگر افسانے'' کے نام سے ہاشمی بک ڈپو لاہور سے 1937 میں شائع ہوا۔ اس میں ''عورت'' کے عنوان سے ایک ایکٹ کا ایک طویل ڈراما شامل ہے جس کی بنیاد پر اس مجموعے کا نام عورت اور دیگر افسانے رکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے علاوہ سودا، میرا ایک سفر، سڑک، پن، غریبوں کا بھگوان اور استخارہ نام کی چھ کہانیاں بھی شامل ہیں۔

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''شعلۂ جوالہ'' 1968 میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ ''وہ اور دوسرے افسانے، ڈرامے'' کے نام سے 1977 میں شائع ہوا۔ اس میں کل گیارہ افسانے چھ ڈرامے اور ایک مضمون شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے افطاری، آصف جہاں کی بہو، چور، سودا، چھدا کی ماں، وہ، ساس اور بہو، میرا ایک سفر، بے زبان، مجرم کون اور صفر ہیں۔

رشید جہاں کے کل افسانے کتنے ہیں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ انھوں نے لکھنے کے لیے کوئی وقت متعین نہیں کیا تھا وہ جب قید تھیں تب بھی لکھا۔ جب سفر میں تھیں تب بھی لکھا۔ لیکن ان کی زندگی میں ان کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں چھ افسانے شامل ہیں۔ اگرچہ بعد میں دوسرے لوگوں نے ان کے افسانے مرتب کرکے دو مجموعوں میں شائع کیے ہیں لیکن ان میں رشید جہاں کے سبھی افسانے شامل نہیں ہیں۔

رشید جہاں نے افسانوں کے علاوہ ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ ہمارے محققین رشید جہاں کے افسانوں کی طرح ان کے ڈراموں کی تعداد کے حوالے سے بھی خاموش ہیں۔ 'پردے کے پیچھے' 1932 میں انگارے میں شائع ہوا اور ڈراما ''عورت'' 1937 میں شائع ہونے والی کتاب ''عورت اور دیگر افسانے'' میں شامل ہے۔ ان کے دوسرے ڈراموں میں بچوں کا خون، نفرت، مرد و عورت، کانٹے والا، پڑوسی، ہندوستانی، گوشۂ عافیت، جوڑ توڑ اور نئی پود کو ملا کر ان کے ڈراموں کی تعداد گیارہ ہوجاتی ہے۔

ان کے مضامین کے حوالے سے بھی ابھی تک کوئی مدلل بحث نہیں ہوسکی۔ رشید جہاں پر لکھنے والے اس باب میں یا تو خاموش نظر آتے ہیں یا بے حد سرسری اظہار خیال کرتے ہیں۔ رشید جہاں نے اگرچہ رسالہ ''نیا ادب'' کو بھی دیکھا اور خود اپنا رسالہ ''سنگار'' محمود الظفر کے ساتھ 1938 میں جاری کیا، اور ایک سال کے بعد دوسرا سیاسی ماہنامہ ''چنگاری'' کے نام سے 1939 میں نکالنا شروع کیا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان رسالوں کے متعلق تفصیلات حاصل نہیں ہوسکی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ ان دو رسالوں میں مضمون نہ سہی لیکن رشید جہاں نے اداریے تو ضرور لکھے ہوں گے آل احمد سرور نے لکھا ہے ''لیکن رشید جہاں کے مضامین کی ہی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں تو معمولی باتوں کا کیا ذکر'' رشید جہاں کے دستیاب مضامین کی تعداد چھ ہے جن کے نام کچھ اس طرح ہیں:

(1) منشی پریم چند اور ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس (2) ہماری آزادی (3) عورت گھر سے باہر (4) ادب اور عوام (5) اردو ادب میں انقلاب کی ضرورت (6) چندر سنگھ کڑھوالی

رشید جہاں کے اردو ادب پر جو احسانات ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزاروں میں رشید جہاں کا نام اور کام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا اور اردو افسانے میں ان کے موضوعات کے انوکھے پن اور لہجے کی بے باکی نے آئندہ لکھنے والی خواتین کو حوصلہ دیا۔ ان کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ ان کے افسانوں نے اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کردیا۔ وہ ایک فرض شناس اور ماہر ڈاکٹر تھیں اس لیے انھوں نے اس تجربے سے بھی پورا فائدہ اٹھایا۔

□□□

Chaudhary Imtiyaz Ahmed
Research Scholar
Dept. of Urdu
Allahabad University
Prayagraj-211002 (U.P

شاعرات کے منتخب اشعار

نہ ہجر میں مجھے پر آب دیدہ ہونا تھا
کیا تھا عشق تو پھر برگزیدہ ہونا تھا

اسی نے عشق کو تیرے جہاں میں فاش کیا
تجھے نہ قیس گریباں دریدہ ہونا تھا

راضیہ خاتون جمیلہ

تمھیں کہو یہ نگوں بخت کیا کرے آخر
ہوائے دہر جسے میری طرح راس نہ ہو

مرے تصور حدود گماں سے بالا تر
ترا وہ 'فضل' کہ جس کا کبھی قیاس نہ ہو

امینہ بیگم شروانی

عمر گزری وہ اک فسانہ ہے
جو سمجھنے کو تازیانہ ہے

کیا کہیں حال دل نشیں اپنا
فکر دنیا کا وہ خزانہ ہے

نثار فاطمہ کبریٰ

ہر شکن میں ایک دل ہر موج غم میں اک جگر
پوچھئے اس زلف کے قیدی سے زنداں کی بہار

کسی کا درد ہو آنکھوں میں اشک ابل آئے
کسی کا غم ہو دلِ زار درد مند ہوا

محمودہ خاتون محمودہ

ذاتی الم گیا تو غم دوست آ گیا
مہماں سرائے غم دل نزہت رہا سدا

امیدوں سے ہے لطف خطرات الفت
سفینوں سے ہوتی ہے ساحل کی رونق

ز۔خ۔ش

غنچے کی جیب رنگیں نقد خودی سے خالی
ضعف خودی کی شاہد سبزے کی پائمالی

اے زیب مشرقی ہوں قومیں کہ مغربی ہوں
ہے جن کا عزم عالی ان کے نصیب عالی

زیب عثمانیہ

عشق جنوں نواز چلا بزمِ ناز میں
اک اضطراب و شوق کی دنیا لیے ہوئے

مرہم سے بے نیاز ہیں پنہاں یہ زخم دل
کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا لیے ہوئے

رابعہ پنہاں

نہ کوئی راز داں اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا
دل پر داغ کے دم تک ہے عالم میں نشاں اپنا

نہیں ہے جذبۂ اظہار پابندِ زباں بندی
سر شکِ دیدۂ خوں بار ہوگا ترجماں اپنا

بشیر النساء بیگم بشیر

خواجہ عبدالمنتقم

مسلم خواتین کے تعلیمی و عائلی مسائل

مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں، خواہ کوئی بھی مذہب یا تہذیب اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس نے عورت کو ہر معاملے میں برابر کا حق دیا ہے زمینی حقیقت سے انحراف کے مترادف ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک ہو، کوئی بھی تہذیب ہو، کوئی بھی معاشرہ ہو اور کوئی بھی ثقافت، عورتوں کی معاشی، معاشرتی و عائلی حیثیت ثانوی رہی ہے خواہ مقدس کتابوں، دھرم گرنتھوں دساتیر و دیگر قوانین میں ان کو برابری کا درجہ کیوں نہ دے دیا گیا ہو۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں یا گزشتہ دو صدیوں میں قوانین کی تدوین کے بعد مختلف مذاہب میں خواتین کے ساتھ تفریقی رویے میں کافی کمی آئی ہے کیونکہ قوانین پر مذاہب کا رنگ بتدریج کم ہوتا چلا جا رہا ہے اور عورت وقت گزرنے کے ساتھ با اختیار ہوتی جا رہی ہے۔ مگر ہندوستان میں مسلم خواتین زندگی کے ہر شعبے میں اپنی غیر مسلم بہنوں کے مقابلے میں کافی حد تک پسماندہ ہیں۔ ان کے سامنے بہت سے مسائل ہیں مگر دو اہم مسائل نے انھیں زیر آتش پا کر دیا ہے۔ یعنی تعلیمی و عائلی مسائل۔

دقیانوسیت اور جدیدیت کے بیچ سینڈوچ بنی مسلمان عورت ایک دوراہے پر کھڑی ہے مسلمانوں کا ایک طبقہ اسے صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید رکھنا چاہتا ہے تو دوسرا طبقہ اسے شمع محفل بنا کر واہ واہی لوٹنا چاہتا ہے جب کہ ضرورت اعتدال پسندی کی ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق مسلم خواتین کی شرح خواندگی 59.1 فیصدی ہے جبکہ ہندو خواتین کی شرح خواندگی 65.1 فیصدی ہے اور جین خواتین کی شرح خواندگی 94.1 فیصدی ہے عیسائی، سکھ و بودھ خواتین کی شرح خواندگی بالترتیب 80.3 فیصدی، 69.4 فیصدی و 72.7 فیصدی ہے۔ مسلم خواتین کی یہ شرح خواندگی صرف قرآن کریم پڑھنے اور بنیادی دینی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ہے ورنہ اگر روزگار کے نقطۂ نظر سے شرح خواندگی کا تعین کیا جائے تو شاید یہ شرح ایک فیصدی یا اس کے آس پاس ہی آئے گی۔ یہ صورت حال تو اس وقت ہے جب یہ صریح حدیث ہے کہ ”علم حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے“ یہاں چین سے مراد دور دراز علاقہ ہے۔ یہ دعوت علم صرف مردوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے ہے اور علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔ یہاں تعلیم سے مراد صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی تعلیم مراد ہے۔ کیا ایک ڈاکٹر مریضوں کا علاج کر کے بہترین خدمت خلق انجام نہیں دیتا؟ کیا اس کو اس خدمت خلق کا اجر نہیں ملے گا؟ کیا ایرانی و مصری خواتین اعلیٰ تکنیکی تعلیم حاصل کر کے متعلقہ میدان میں بلندیوں کو نہیں چھو رہی ہیں؟ اب تو خود ہمارے ملک میں بھی مسلم بچے اور بچیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ حال ہی میں الہ آباد کے ایک اوسط درجے کے خاندان کی مسلمان لڑکی عائشہ سعید نے Indian statistical service میں پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ مگر

پھر بھی اگر کچھ جنونی لوگ مسلم بچیوں اور خواتین کو صرف گھر کی چہار دیواری میں مقید کر کے تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ وہ ایسا کرتے وقت اپنے آپ کو سچا مسلمان اور مسلم دانشوروں کو گمراہ تصور کرتے ہیں۔ شاید اس قسم کے مسلمان آج پھر مسلمانوں کو عہد جاہلیت میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں زیادہ تر قوانین سیکولر ہیں اور ان کی بنیاد جنس یا مذہب پر نہیں ہے۔ لہٰذا مسلم خواتین کو بھی وہ تمام مواقع حاصل ہیں جو غیر مسلم خواتین کو حاصل ہیں۔ اگر اس ضمن میں مثبت رویہ اختیار نہیں کیا گیا تو ہماری آنے والی نسلیں اچھی ماؤں سے محروم ہو جائیں گی اور وہ بدلتے ہوئے تکنیکی تعلیمی نظام میں اپنے بچوں کی صحیح پرورش نہیں کر پائیں گی۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستان کا نقصان ہوگا بلکہ دنیا میں بڑھتی ہوئی غربت اور نا انصافی میں مزید اضافہ ہوگا۔

مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ ان کے عائلی مسائل ہیں چونکہ اسلام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے اور اس کے ساتھ شوہر کو با آسانی طلاق دے کر رشتہ ازدواج ختم کرنے کا حق دیتا ہے (حالانکہ ان دونوں حقوق کے من مانے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے اور یہ حقوق کچھ مخصوص حالات میں اور کچھ مخصوص شرائط کے تابع عطا کیے گئے ہیں)۔ کچھ دین اور قانون سے ناواقف لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے معمولی سی بات پر اپنی بیویوں کو طلاق دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں، انھیں طلاق دے دیتے ہیں۔ تشدد آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں، دوسری شادی کرنے کی بات

کرنے لگتے ہیں یا کر لیتے ہیں، بے چاری عورت کو ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کئی طرح کے مسائل سے الجھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ایسی صورت میں اس کو خلع کا بھی حق حاصل ہے مگر ہمارا پسماندہ معاشرہ اس قسم کی عورتوں کو گری ہوئی نظر سے دیکھتا ہے اور طلاق کے بعد ان کی دوسری شادی بھی انتہائی مشکل سے ہو پاتی ہے۔ اس صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے اس پر دینی و ملی ادارے باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس اہم مسئلے کو علمائے دین ومفتیان کرام بتقاضائے وقت و حالات سلجھانے کی حتی المقدور جدوجہد کریں تاکہ قوم وملت کے منتشر شیرازہ کو مزید منتشر ہونے سے بچایا جا سکے۔

معاشرے میں گرتی ہوئی اقدار کے ساتھ مسلمانوں میں بھی خانگی تشدد، شوہر، ساس سسر اور دیگر اعزا کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے سماج میں کچھ ایسے سسرال والے بھی ہیں جو بہو کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں لیکن بیٹی تو بیٹی اسے بہو کا بھی کما حقہ حق نہیں دیتے۔ اپنی بیٹی کو رانی اور بہو کو نوکرانی کا درجہ دینے میں یقین رکھتے ہیں، کبھی جہیز کی مانگ کرتے ہیں، کبھی اس کی شخصی آزادی پر پابندیاں لگاتے ہیں۔ کبھی اسے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ لہٰذا ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام تک یہ بات پہنچائیں کہ اب حکومت نے اس قسم کے لوگوں کو سزا دلانے کے لیے "خانگی تشدد سے

خواتین کا تحفظ ایکٹ 2005" کی شکل میں ایک قانون بنا دیا ہے جس کی رو سے اس قسم کے جرائم کرنے والوں کو سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دینی مبلغین کو بھی چاہئے کہ وہ نماز، روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تلقین کریں کہ اس قسم کا رویہ اختیار کرنے یعنی تشدد آمیز رویہ و مطالبہ جہیز کے لیے انھیں جہیز کے قانون اور متذکرہ بالا قانون کے تحت سزا مل سکتی ہے اور آخرت میں بھی ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ کچھ عورتیں بھی اپنے ناروا رویہ سے فریق ثانی کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہیں مگر عنوان بالا کے تحت یہاں یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں ہے۔

Khwaja Abdul Muntaqim
2-I.P Extn.
Delhi-110092

اردو تحقیق کے مسائل اور حل

نغمہ تبسم

جب سے بنی نوع انسان نے اس کائنات کو اپنا مسکن بنایا ہے تب سے لے کر اب تک اس نے مسلسل اپنے فہم و ادراک، غور و فکر اور جد و جہد کے ذریعہ نئی ایجادات کر کے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش ہی سے کھوج، پرکھ اور جستجو کا خواہش مند رہا ہے۔ انسان کا یہی فہم و ادراک، تحقیقی صلاحیت اور خوب سے خوب تر کی تلاش اسے کائنات کی تمام مخلوق میں سب سے افضل یعنی اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتی ہے۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کا اصل مادہ حق یعنی (ح ق ق) سے ماخوذ ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اصلیت معلوم کرنا، دریافت کرنا، تفتیش، کھوج، پرکھ اور چھان بین کا نام تحقیق ہے، لیکن اصطلاحی معنوں میں تحقیق کو کسی منتخب موضوع سے متعلق چھان بین کر کے کھرے کھوٹے اور اصلی و نقلی مواد میں امتیاز کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی:

> ”تحقیق دراصل تلاش و جستجو کے ذریعہ حقائق معلوم کرنے اور ان کے تصدیق کرنے کا نام ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔“

(مشمولہ، آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر محمد اکمل، صفحہ نمبر20)

تحقیق کو انگریزی میں Research کہتے ہیں جس کے معنی دو بارہ تلاش کرنے کے ہیں۔ دراصل لفظ Research فرانسیسی لفظ Researcher سے نکلا ہے۔ جس کے معنی پیچھے جا کر تلاش کرنے کے ہیں۔ بقول شیریڈن بیکر:

> ”ریسرچ کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہے۔ یعنی جہاں دوسروں نے تلاش کی وہیں پھر تلاش کر کے ایسی نئی بات کھوج نکالنا جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔“

(تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، صفحہ نمبر10)

پروفیسر عبدالستار دلوی کے لفظوں میں:

> ”تحقیق کسی مسئلے کے قابل اعتماد حل اور صحیح نتائج تک پہنچنے کا وہ عمل ہے، جس میں ایک منظم طریقہ کار، حقائق کی تلاش، تجزیہ اور تفصیل کاری پوشیدہ ہوتی ہے۔“

(مشمولہ، آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر محمد اکمل، صفحہ نمبر20)

اس تعریف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحقیق سے متعلق نظریات و بیانات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق سچائی کی تلاش میں حقائق کو پانے کا نام ہے۔ جس کے ذریعہ گمشدہ کڑیوں سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ادبی تحقیق ایسے موضوع پر ہونی چاہیے جو ہمارے ادب کی گمشدہ کڑیوں کو پردۂ سیمیں پر لانے میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔

تحقیق کا کام بڑی عرق ریزی اور صبر و سکوں کا ہے، جس میں محقق کو نہایت ہی صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ دورانِ تحقیق اسے کئی دشوار طلب راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کئی ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن کو حل کرتے ہوئے وہ اپنی تحقیق کو بہتر اور معیاری بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہاں ادبی تحقیق کے مسائل اور حل سے راقمۃ الحروف کی مراد ان نامور محققین کے کارناموں سے متعلق موضوع زیرِ بحث نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں سندی تحقیق کے دوران ریسرچ اسکالروں کو درپیش مسائل اور ان کے حل پر گفتگو مقصود ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ادبی تحقیق سے متعلق ریسرچ اسکالر کے تمام مسائل اور حل کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن حتی الامکان میں نے ان چند مسائل اور ان کے حل کو زیرِ بحث

لانے کی کوشش کی ہے جو ادبی تحقیق میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

تحقیق میں ایک اسکالر کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ ادبی رجحان سے متعلق عدم دلچسپی کا ہوتا ہے۔خواہ کوئی ریسرچ اسکالر کتنی ہی صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ ہو اور ادبی اصناف پر بیک وقت مہارت بھی رکھتا ہو لیکن اگر ان اصناف کے تئیں اس کی دلچسپی نہیں ہے تو اس سے متعلق موضوع پر وہ کبھی بھی اپنا تحقیقی کام یکسوئی سے انجام نہیں دے سکتا ہے۔اس لیے محقق کو خود اس بات کا تعین کرنا چاہیے کہ اس کا ادبی رجحان کس صنف یا عہد، تحریک و رجحان سے متعلق ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی ریسرچ اسکالر کو شاعری سے دلچسپی ہے لیکن اس کو تحقیق کرنے کے لیے لسانیات جیسا خشک اور پیچیدہ موضوع دے دیا جائے جو اس کی عدم دلچسپی کا باعث بنے تو ایسے موضوع پر وہ کبھی بھی معیاری تحقیق نہیں کرسکتا۔اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ ریسرچ اسکالر کو وہی موضوعات دیں جن سے طلباء کو ذہنی مناسبت ہوتا کہ وہ پوری لگن اور محنت سے اپنے تحقیقی کام کو انجام دے سکیں۔

اس کے علاوہ اسکالر کو موضوع کے انتخاب سے قبل اپنی دلچسپی سے متعلق مختلف موضوعات کا باریک بینی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔تاکہ اسے معلوم ہوسکے کہ کن موضوعات میں کہاں تک تحقیق کی گنجائش و امکانات ہیں اور اس تحقیقی کام سے علم و ادب کی دنیا میں کوئی انکشاف یا اضافہ ہو رہا ہے، اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تحقیق میں ایک اہم ترین مسئلہ موضوع کے انتخاب کا بھی ہے جو نہایت ہی دشوار کن مرحلہ ہے۔اکثر و بیشتر طلباء اس مرحلے میں ناکام ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً کبھی کبھی ایسے موضوع کا انتخاب کر لیتے ہیں جو ان کے ادبی رجحان اور فطری میلان سے مطابقت نہیں رکھتا ہے، چونکہ ایک طالب علم جو ایم۔اے پاس کر کے ابھی تحقیق کی دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ ایم۔فل کا ہو یا پی۔ایچ۔ڈی کا اس کے پاس اتنا شعور نہیں ہوتا ہے کہ وہ ادبی تحقیق کے موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے مناسب موضوع کا انتخاب کر سکے۔

دیکھا جائے تو ہندوستان کی بعض جامعات میں ایسے اُردو شعبۂ جات بھی موجود ہیں جہاں ریسرچ اسکالر کی علمی لیاقت و ذہنی رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے ذریعہ منتخب کیے ہوئے موضوع کے انتخاب کا انھیں پورا حق حاصل ہوتا ہے، لیکن بعض جامعات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام طور پر صدر شعبہ اور کمیٹی دونوں کے آپسی مشورہ سے تحقیقی موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔قطع نظر اس کے کہ طالب علم اس خاص موضوع پر کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ نہیں۔لہٰذا ریسرچ اسکالر کے سامنے کبھی کبھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے سرپرستوں سے مفاہمت کرنی پڑتی ہے اور ایسے موضوع پر کام کرنا پڑتا ہے جو نہ نگراں کے لیے اطمینان بخش ہوتا ہے اور نہ ریسرچ اسکالر کی ذہنی مناسبت سے میل کھاتا ہے۔

موضوع کے انتخاب ہی سے متعلق ریسرچ اسکالر کے سامنے ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی درپیش آتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس موضوع پر پہلے سے کوئی تحقیقی کام ہو چکا ہے یا ہندوستان کی کسی جامعہ میں اس موضوع پر کوئی ریسرچ اسکالر کام تو نہیں کر رہا ہے؟ یا وہ جس موضوع پر کام کر رہا ہے اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام مسائل کا ایک ساتھ حل نہ تو کسی بھی جامعہ کے پاس ہے اور نہ شعبے کے پاس، اس لیے تمام جامعات میں خاص کر اُردو شعبۂ جات میں ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی موضوعات سے متعلق (اشاریہ) وغیرہ تیار کیا جانا چاہیے، کیونکہ اکثر جامعات میں موضوعات کی تکرار دیکھنے کو ملتی ہے، ساتھ ہی کس یونیورسٹی میں کس موضوع پر تحقیق ہو رہی ہے یہ بھی پتہ نہیں چل پاتا ہے۔اس کے لیے حتی الامکان یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ایک ایسی فہرست مرتب ہو جس میں تحقیق شدہ اور غیر تحقیق شدہ موضوعات درج کیے جائیں۔ساتھ ہی ان مسائل سے دیگر جامعات کے اُردو شعبۂ جات کو بھی آگاہ کراتے رہنا چاہیے۔

اس کے علاوہ تحقیقی موضوع سے متعلق کسی ایسے رسالے کا اجرا عمل میں لایا جانا چاہیے جس میں وقتاً فوقتاً ہندوستان کی مختلف جامعات میں ہو رہے تحقیقی موضوعات کا ذکر ہو، اس سے دو فائدے ہوں گے۔ایک تو اسکالر موضوعات کی تکرار سے بچے گا اور دوسرا کون سی یونیورسٹی میں کس موضوع پر کام ہو رہا ہے یہ آسانی سے پتہ لگایا جا سکے گا، نیز اسکالر اپنی علمی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اُردو ادب کے کچھ نئے موضوعات پر ایک نئے زاویے سے تحقیق کرنے کے لیے موضوع کا انتخاب کر سکے گا۔ اس طرح ہم ہندوستان میں اُردو تحقیق کے معیار کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

موضوع کے انتخاب کے بعد ریسرچ اسکالر کے سامنے ایک اور اہم مسئلہ نگراں کے انتخاب کا ہوتا ہے۔بعض جامعات میں تو طلباء کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند و موضوع کی مناسبت سے خود نگراں کا انتخاب کرے لیکن بعض جامعات میں انتظامی امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صدر شعبہ یہ دیکھتا ہے کہ جملہ اساتذہ میں سے کس کے پاس جگہ خالی ہے لیکن انھیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ وہ اساتذہ اس موضوع کے متعلق کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ایسا بھی نہیں ہے کہ شعبے کا ہر استاد بیک وقت تمام ادبی اصناف پر مہارت رکھتا ہو اور اس میں بحیثیت نگراں کے فرائض کو

کامیابی سے انجام دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ آخر کار نگراں بھی تو انسان ہوتے ہیں ان کی اپنی ذاتی دلچسپی ہوتی ہے، چونکہ دورِ حاضر کا انسلاک عہدِ تخصص سے کیا جاتا ہے۔ فہم وادراک رکھنے والا انسان حتی الامکان اس کوشش میں لگا رہتا کہ کسی ایک میدان میں مہارت حاصل کرے جو اس کے طبعی میلان کے مطابق ہو۔ یوں تو ہر استاد کی طرح اُردو ادب کے استاد کا ذہن پورے ادب کا احاطہ کرتا ہے مگر اپنی ذہنی مناسبت کی بنا پر کسی ایک موضوع کا ماہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نگراں جس کا Specialisation فکشن ہے اب یہ ضروری نہیں کہ وہ صنفِ شاعری میں بھی مکمل دسترس رکھتا ہو۔ حالانکہ شاعری سے متعلق موضوع پر بھی وہ نگراں کے فرائض انجام دے سکتا ہے مگر فکشن پر مبنی جس معیار کی تحریر اس کی رہنمائی میں صفحۂ قرطاس پر قلم بند ہو سکتی ہے وہ شاعری پر تحقیق میں ممکن نہیں ہے۔

موضوع کا انتخاب، ریسرچ اسکالر اور نگراں تحقیق کے یہ تین اہم اجزاء ہیں جو معیاری اور بہترین تحقیق کے ضامن ہیں۔ اس لیے ان تینوں میں مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیے یہی وجہ ہے کہ ریسرچ اسکالر کو نگراں کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ نگراں ایسا ہو جسے تحقیقی موضوعات میں بنیادی معلومات، مہارت اور دلچسپی ہو کیونکہ محقق کو اگر اس کے نگراں کی طرف سے پوری رہنمائی ملتی ہے تو تحقیق کے میدان میں جو بھی مسائل درپیش آتے ہیں ان کا حل آسانی سے نکالا جا سکتا ہے اور ادبی تحقیق کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔

ادبی تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالر کو جن مآخذ سے استفادہ کرنا ہوتا ہے۔ ان میں بیش تر اُردو کے علاوہ کئی زبانوں میں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دورانِ تحقیق زبان کا مسئلہ درپیش آتا ہے، کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ محقق ادبی تحقیق کرنے کے لیے جس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے اس کے تمام مواد اسی زبان میں دستیاب ہوں جس سے وہ واقف ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ محقق کو بیک وقت تین زبانوں پر عبور ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی ریسرچ اسکالر بعنوان ''سجاد حیدر یلدرم کے ترکی تراجم افسانوں اور اصل متون کا تقابلی جائزہ'' پر تحقیق کرنا چاہتا ہے تو ایسی صورتِ حال میں اس کی تحقیق میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے، چونکہ اصل متون ترکی زبان میں موجود ہیں اور محقق اس زبان سے ناواقف ہے۔ لہٰذا ریسرچ اسکالر کو ترکی زبان سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر موضوع داستان پر ہے تو اسے فارسی زبان کی معلومات ہونی چاہیے یا موضوع فکشن جیسے (ناول، افسانہ، یا ڈراما) وغیرہ پر ہے تو انگریزی زبان سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

''موضوع کا انتخاب، ریسرچ اسکالر اور نگراں تحقیق کے یہ تین اہم اجزاء ہیں جو معیاری اور بہترین تحقیق کا ضامن ہیں۔ اس لیے ان تینوں میں مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیے یہی وجہ ہے کہ ریسرچ اسکالر کو نگراں کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ نگراں ایسا ہو جسے تحقیقی موضوعات میں بنیادی معلومات، مہارت اور دلچسپی ہو کیونکہ محقق کو اگر اس کے نگراں کی طرف سے پوری رہنمائی ملتی ہے تو تحقیق کے میدان میں جو بھی مسائل درپیش آتے ہیں ان کا حل آسانی سے نکالا جا سکتا ہے اور ادبی تحقیق کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے''

تحقیق میں موضوع سے متعلق مواد کی عدم دستیابی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس میں ریسرچ اسکالر کو کئی ایسے مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ کر اپنی تحقیق کو بہتر ثابت کرنا ہوتا ہے۔ بقول عبدالستار دلوی:

> ''مواد کی فراہمی میں محقق کو ایک جاسوس کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور اس کو مکھیوں کے ذریعہ شہد کی فراہمی جیسی محنت ومشقت سے کام لینا پڑتا ہے۔''

(مشمولہ، تحقیق شمارہ نمبر 16 شعبۂ اُردو آرٹس فیکلٹی، سندھ یونیورسٹی جام شورو، صفحہ نمبر 19)

موضوع کا انتخاب ہو جانے کے بعد ریسرچ اسکالر ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ اس کی تحقیق کے لیے کون سے مواد (بنیادی یا ثانوی) کی ضرورت ہے اور اسے یہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں؟ بعض موضوعات سے متعلق مواد تو ہندوستان کی مختلف جامعات کے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں لیکن بعض دفعہ اسکالر کو ان ہی کتب خانوں میں مواد کی عدم دستیابی کا شکار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایم فل اور پی ایچ ڈی اسکالر کے عنوان سے متعلق مواد مرکزی کتب خانوں میں دستیاب ہوں۔ اس کے علاوہ اگر مواد تک رسائی ہو بھی جاتی ہے تو اس میں اتنے شک اور شبہات

پائے جاتے ہیں کہ اسکالر ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ماخذ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنی تخلیق کو عقیدتاً اپنے پیر و مرشد سے منسوب کر دیتا ہے اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب کوئی ریسرچ اسکالر اس فن پارے کو اپنا تحقیقی موضوع بناتا ہے تو ایسی صورتِ حال میں محقق کے لیے یہ طے کر پانا نہایت ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر اس فن پارے کا اصل خالق کون ہے۔ اگر اس پیر و مرشد کا شمار بھی ادیبوں میں ہوتا ہے اور محقق اس کی تخلیقات تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو تحقیقی فن پارہ اور دستیاب تخلیقات کے موازنہ کے ذریعہ شاید یہ پتا لگانا ممکن ہو کہ تحقیقی موضوع کا اصل خالق کون ہے ورنہ یہ ایک مبہم پہیلی بن کر رہ جاتا ہے اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف شبہات کی بنا پر ان ہی پیر و مرشد کو اس تحقیقی فن پارے کا خالق تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کے مشکوک نتائج تحقیقی اصول پر کھرے نہیں اترتے۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریسرچ اسکالر جس موضوع پر کام کر رہا ہوتا ہے اس کا بیشتر مواد بیرون ممالک جیسے پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، برطانیہ وغیرہ کی لائبریریوں میں ہوتے ہیں جس میں حمل و نقل کا مسئلہ سامنے آتا ہے جن میں بعض اسکالر خصوصاً طالبات کو بیرونی شہروں کا سفر کرنے میں مشکل درپیش آتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ ان مواد تک رسائی کیسے حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ الگ سے ریسرچ اسکالر کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

مواد کی عدم دستیابی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ ملک اور بیرون ممالک دونوں جگہوں کے اسکالروں سے ربط و تعلق قائم کریں تا کہ بعض ریسرچ اسکالر بھی اس مسئلے سے واقف ہوں۔ ساتھ ہی دیگر جامعات کے اساتذہ خاص کر اُردو شعبۂ جات کو چاہیے کہ مواد کی فراہمی کے مسائل، کتب خانوں کی کمی اور مخطوطات تک رسائی جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی معقول انتظام کریں۔

عصرِ حاضر میں ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ رسائل و جرائد سے استفادہ حاصل کریں اور ان رسائل و جرائد کی اشاریہ سازی پر جو کام ہو رہا یا ہو چکا ہے اس کو بھی دیکھیں۔ ایسا کرنے سے کم وقت میں زیادہ مواد سامنے آجاتا ہے اور تحقیق میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ اور ٹکنالوجی کے عہد میں انٹرنیٹ جیسی سہولیات دستیاب ہیں۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اپنی تحقیق کو کار آمد بنائیں، کیونکہ عہدِ حاضر میں انٹرنیٹ پر بہت ساری ایسی ویب سائٹس موجود ہیں جو براہِ راست مواد کی فراہمی میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ ان میں ریختہ اُردو کی نہایت کار آمد ویب سائٹ ہے۔ جہاں اُردو کی وہ تمام کتابیں دستیاب ہیں جو نہ اب مارکیٹ میں ملتی ہیں اور نہ کسی کتب خانے میں موجود ہیں۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ اس سے بھی استفادہ کریں۔

دیگر جامعات کے خاص کر اُردو شعبہ کے صدر کو چاہیے کہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر سیمینار منعقد کریں اور ریسرچ اسکالرس کو بھی مقالے پڑھنے کے مواقع فراہم کریں تا کہ ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ اس کے علاوہ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ بحث و مباحثہ میں بھی حصہ لیں اور دیگر جامعات میں جا کر اپنے موضوع سے متعلق اساتذہ و محققین سے بات چیت کریں اور اپنے اندر نہ صرف ایک مثبت سوچ پیدا کریں بلکہ ملک میں تحقیق کے جو بھی ذرائع فراہم ہیں اس سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔

جب ریسرچ اسکالر تحقیق کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوتا ہے جہاں اسے والدین سے مالی تعاون لینے میں ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورانِ تحقیق ریسرچ اسکالر کو اقتصادی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ جامعات کی طرف سے طالب علم کو ایک معقول رقم ریسرچ کرنے کی حیثیت سے ملتی ہے۔ لیکن اسکالر کے سامنے کئی ایسے مسائل ہیں جن کا حل جامعات کے پاس نہیں ہے۔ مثلاً اُردو میں تحقیق کرنے کے لیے ایک اسکالر کو ملک اور بیرون ملک دونوں کے کتب خانوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ جن کے لیے کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ یونیورسٹی جو اسکالرشپ دیتی ہے ان سے تحقیقی اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں۔ اگرچہ U.G.C. بھی بہت ساری اسکیموں کے تحت ریسرچ اسکالر کو مالی تعاون دیتی ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہر اسکالر ان اسکیموں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ معیاری اور بہترین تحقیق کے لیے ایک محقق کا اقتصادی طور پر مضبوط ہونا بہت ضروری ہے۔ اسکالر کو اپنی تحقیق کے دوران بہت ساری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ یہ ضرورت تب ہی اچھے سے پوری کر سکتا ہے جب اس کی معاشی حالت بہتر ہو۔ یہاں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک محقق کی اگر اقتصادی حالت خراب ہے تو وہ اچھی تحقیق نہیں کر سکتا ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ تحقیق کو کیسے کار آمد بنایا جائے۔ اس ضمن میں ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں جو تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں ان کو شائع کروانا چاہیے کیونکہ جب تک وہ تحقیقی مقالہ شائع نہیں ہوگا طلباء کو کیسے علم ہوگا کہ کاروانِ ادب کن منزلوں

سے گزر رہا ہے۔ اس لیے ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ پوری ایمانداری برتیں اور اس کو چھپائے نہیں بلکہ چھپوائیں، تاکہ آگے آنے والے طلبا اس سے مستفید ہوسکیں۔

ریسرچ اسکالر کے لیے ملازمت بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ آج کے اس مسابقتی دور میں ایک محقق کو ہر وقت اپنی ملازمت کی فکر لگی رہتی ہے۔ آج وہ پی ایچ۔ ڈی میں صرف اس لیے داخلہ لیتا ہے کہ اس کو سند مل جائے جس کے بل بوتے پر وہ ایک اچھی ملازمت حاصل کر سکے۔ اس کے ذہن میں ہر وقت یہی بات چلتی رہتی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا تحقیقی کام مکمل کرے اور روزگار حاصل کرے۔ اس ملازمت کی جلد بازی میں وہ اپنی ریسرچ پر پوری طرح توجہ نہیں دے پاتا ہے۔ نتیجتاً اس کی تحقیق متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا حکومتِ ہند کو چاہیے کہ اس طرف دھیان دے، کیونکہ ایک اچھی تحقیق کے لیے محقق کو Job Security دینی ضروری ہے۔ جب اسے روزگار کی فکر کم رہے گی تو وہ پوری دل جمعی کے ساتھ اپنا تحقیقی کام انجام دے پائے گا۔

الغرض ادبی تحقیق کو سمجھنا، ان پر غور کرنا اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا ایک مسلسل عمل ہے، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ مسائل کے رضا کارانہ طور پر حل تلاش کیے جا سکتے ہیں، لیکن بعض مسائل ایسے ہیں جن کے حل کے لیے تعلیمی و تحقیقی اداروں اور حکومت کو اقدامات اٹھانے پڑیں گے۔ بہتر ماحول ہی میں بہتر تحقیقی کام ممکن ہے۔

Naghma Tabassum
H. No. 1/35/B/523-1-8
Hakeem Shah Colony
Virat Nagar, Street No.1
Mahmood Begam Home, Ayesha Masjid
Virindavan Colony Toli Chowki
Hyderabad-500008 (Telangana)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

رئیس فاطمہ

اردو داستانوں میں نسوانی منفی کردار کی فعالیت

داستان بنیادی طور پر تحریری فن نہیں ہے بلکہ سنانے کا فن ہے۔ اس کے لیے قاری کی جگہ سامعین ہوتے ہیں۔ داستان کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے تحریر کردیا جائے پھر بھی بیان کرنے کا انداز نہیں بدلتا۔ اس کی عبارت ایسی ہوتی ہے گویا کوئی کہانی سنا رہا ہو۔ اردو کے تقریباً سبھی ناقدین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ داستان سننے سنانے کی چیز ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی معروف کتاب 'ساحری، شاہی، صاحب قرانی میں 'بیانیہ' پر تفصیل سے لکھا ہے ساتھ ہی ناول اور داستان کے بیانیہ کی تفریق بھی کی ہے:

''بیانیہ کی شعریات میں بعض باتیں یقیناً ایسی ہیں جو تمام بیانیہ میں مشترک ہوسکتی ہیں۔ان کا تعلق بیانیہ کے طرزِ وجود (ontology) سے ہے،اس کی علمیات (epistimology) سے نہیں .... داستان کی صفت یہ ہے کہ اس میں مستقبل کی باتیں بسا اوقات پہلے ہی منکشف کردی جاتی ہیں، مختصراً یا مطولاً۔ پھر وہ سارے واقعات اپنے وقت پر دوبارہ بیان ہوتے ہیں لہٰذا تجسس (suspense) کی وہ نوعیت باقی نہیں رہتی جو ہمیں عام ناولاتی فکشن میں نظر آتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں انسان فاعل (subject) سے زیادہ کارکنند (agent) کے روپ میں نظر آتا ہے۔ یہ بھی ناول کی عام شعریات کے منافی ہے تیسری بات یہ ہے کہ ایک بار بیان کیے ہوئے واقعات

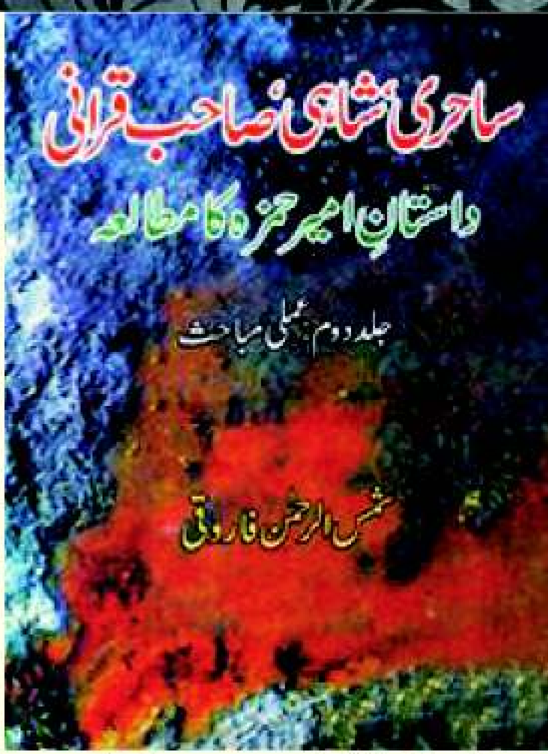

کو بیان کریں تو گویا ایک ہی fabula کے لیے دو subject خلق ہوں گے ایسی صورت میں قصے کا وہ تصور معرضِ خطر میں آجاتا ہے جو ناول میں اہمیت رکھتا ہے۔''

(ساحری شاہی، صاحب قرانی، ص:54)

جس طرح ناول اور داستان کے بیانیہ میں فرق ہے اسی طرح

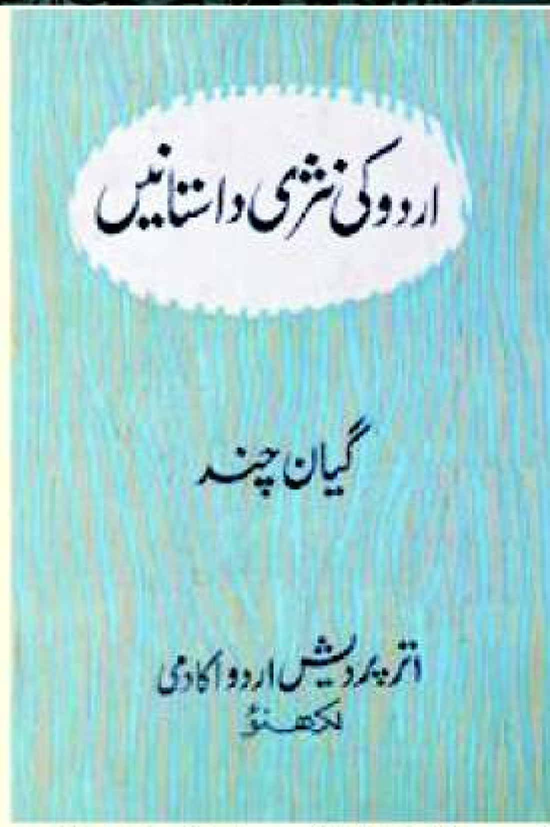

کرداروں میں بھی تفریق نظر آتی ہے۔ ناول کے کردار عموماً انسانی فطرت سے مانوس ہوتے ہیں۔ ان کے افعال وحرکات وسکنات کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہوتا ہے، ہمیں ان کی تمام کارکردگی اپنے اطراف میں دیکھنے کو مل جاتی ہے جب کہ داستان میں ہمیں انسانی خصوصیات نظر آتی ہیں لیکن انتہائی منزل پر، داستان کے کرداروں کو اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں تمام اوصاف انتہا پر ہوتے ہیں، کردار چاہے عورت کا ہو یا مرد کا جو جس صفت کا مالک ہوگا وہ پیدا ہوتے ہی ان میں نظر آجاتی ہے یا پھر اکثر قبل پیدائش ان کے متعلق پیشین گوئی کر دی جاتی ہے۔ بچپن سے ہی وہ ان تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جن کا انھیں آنے والے وقت میں مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی (مثلاً امیر حمزہ) شجاعت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ سات برس کے سن میں حشام بن علقمہ خیبری کو مار دیتا ہے، بارہ برس کے سن میں ہندوستان کو فتح کر لیتا ہے، چھتیس برس کے سن تک نوشیرواں کو شکست دیتا ہے۔ غرض قریب وبعید کی کوئی بھی مشکل ہو انھیں آسانی سے سر کرتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف ہیرو ہی میں نہیں بلکہ دیگر کرداروں میں بھی نظر آتی ہے کہ وہ بچپن سے ہی آنے والے وقتوں میں اپنی خوبیوں یا خامیوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اسی طرح نسوانیت کے تمام حسن ونزاکتوں کی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح بری عورتوں کے کردار تمام برائیوں سے پر نظر آتے ہیں، یہ اوصاف بھی ان میں ابتدا سے ہوتے ہیں:

’’کردار اور کیا ہے؟ بس واقعے کو متعین کرنے والی شئے۔ واقعہ اور کیا ہے، بس کردار کے (خواص) کے لیے مثال۔‘‘ (بحوالہ ساحری شاہی صاحب قرانی جلد اول، ص:95)

کردار کی روح دراصل وہ اوصاف وحرکات ہیں جن کی بنیاد پر کہانی میں ان کے مقام ومعیار کا تعین کیا جاتا ہے۔ کردار فرضی بھی ہو سکتے ہیں اور حقیقی بھی، نیک بھی ہو سکتے ہیں اور بد بھی، واضح اور مثالی بھی ہو سکتے ہیں پیچیدہ اور مبہم بھی، انسانی شکل وصورت میں ہو سکتے ہیں اور غیر انسانی بھی، اس کا تعین کہانی میں اس کی سیرت کرتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین داستانوی کرداروں کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

’’کردار نگاری محض ایک اصول ہے۔ مثالیت دو فریق ہے، ایک وہ ہیں جو خوبیوں کی پوٹ ہیں، دوسرے وہ جو بدی کا مجسمہ ہیں۔ یہ نہیں کہ نیکیوں کے ساتھ انسانی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ شاید ان میں کمزوری ہوتی ہی نہیں۔

(اردو کی نثری داستانیں 72)

پروفیسر گیان چند جین نے داستانوی کردار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نیک اور بد، یہ تقسیم کرداروں کے اوصاف کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اچھائی اور نیکی کا مجسمہ کہانی کا مثبت کردار اور برائی کا پتلہ منفی کردار۔ قدیم قصوں میں خیر وشر کی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور عین فطرت کے مطابق خیر کی فتح اور شر کی شکست ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیکی وبدی کہانی کے دو اہم عناصر ہیں۔ یہ کبھی سامنے آکر لڑتے ہیں اور کبھی اپنی عیاری کے ذریعہ کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں یا پھر مبہم اور مخلوط ہو کر کشمکش پیدا کرتے ہیں جن کا تجزیہ کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ خیر کی اہمیت کا دارومدار براہ راست یا بالواسطہ شر ہی پر ہے۔ شر کے متعلق عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

’’شر ہر وہ چیز ہے جس سے کوئی کراہت کرے یا اس سے نقصان پہنچے‘‘۔

محمد مفتی شفیع نے علامہ ابنِ قیم کے حوالے سے شر کے معنی بیان کرتے ہوئے اسلام میں تصور شر کی وضاحت یوں پیش کی ہے:

’’یہ لفظ شر دو چیزوں سے مستعمل ہے ایک آلام وآفات جن سے براہ راست انسان کو رنج وتکلیف پہنچتی ہے۔ دوسری وہ چیزیں جو آلام وآفات کے موجبات اور اسباب ہیں۔ اس

دوسری قسم میں کفر و شرک اور تمام معاصی بھی لفظ 'شر' کے مفہوم میں داخل ہیں۔"

خیر اور شر کی مقابلہ آرائی تو اس وقت سے ہے جب سے یہ دنیا خلق ہوئی ہے۔ قدیم ہندو دیو مالائی قصے ہوں یا دیگر مذاہب کی کتاب مقدس، سب میں دیوی دیوتاؤں یا راکشسوں کے قصے یا پھر آدم و ابلیس یا اسی قسم کے واقعات ضرور ملتے ہیں۔ داستان کی بنیاد بھی خیر و شر پر ہے۔ اگر چہ انسانی ہمدردی ہیرو کے ساتھ رہتی ہے لیکن کہانیوں میں منفی کردار ہی جان ڈالتے ہیں۔ ہیرو کو challenge کرتے ہیں، انھیں مشکلات میں ڈالتے ہیں۔ جس سے ہیرو بہت مشقت سے یا سحر و ساحری / تعویز سلیمانی کی مدد / کسی غیبی مدد/wise old man کے مشورے سے باہر نکلتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہیرو کبھی ہمت نہیں ہارتا، آخری سانس تک جنگ کرتا ہے، پریشانیاں برداشت کرتا ہے صحرا نوردی کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ویلن بھی آخری سانس تک ہیرو کے کام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں یہاں تک کے موت آ جائے یا پھر بے بس ہو جائیں۔

ویلن کردار بہت پر جوش ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی تساہلی نظر نہیں آتی اپنے دشمن سے انتقام یا کسی بھی قسم کی بد فعلی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں لیکن یہ وہی افعال انجام دیتے ہیں جو ان کی ذات کا خاصہ ہوتی ہے۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے اکثر ہیرو اور ہیروئن بھی ویلن بن جاتے ہیں۔ ایسی مثال باغ و بہار میں بھی موجود ہے کہ ہیروئن اپنے محبوب سے ملنے کے لیے سرنگ بنواتی ہے۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں یہاں تک کہ اپنے والدین کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

داستانوی ادب کا قدیم اسطوری کہانیوں سے گہرا رشتہ ہے۔ اساطیری عہد کی ابتدا دراصل "سومیری عہد" سے ہوتی ہے۔ اس عہد کی کہانیوں میں منفی کرداروں کی نوعیت آج سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یونانی، مصری، یورپی اور ہندوستانی کہانیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا وجود ہر عہد میں کم و بیش یکساں رہا ہے۔ سومیری عہد کی کہانیوں میں "چرواہا اور کسان" میں ایسا ہی ایک کردار "دموزی" کا ہے جو مکمل طور سے منفی تو نہیں البتہ اس کے رویہ سے اس کے ویلن ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قدیم کہانیوں میں بعض ایسی کہانیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ویلن ہی ہیرو ہوتا ہے مثلاً 'چاند کی پیدائش' کا 'ان لل'۔ یہ ہیرو بھی ہے اور

"خیر اور شر کی مقابلہ آرائی تو اس وقت سے ہے جب سے یہ دنیا خلق ہوئی ہے۔ قدیم ہندو دیو مالائی قصے ہوں یا دیگر مذاہب کی کتاب مقدس، سب میں دیوی دیوتاؤں یا راکشسوں کے قصے یا پھر آدم و ابلیس یا اسی قسم کے واقعات ضرور ملتے ہیں۔ داستان کی بنیاد بھی خیر و شر پر ہے۔ اگر چہ انسانی ہمدردی ہیرو کے ساتھ رہتی ہے لیکن کہانیوں میں منفی کردار ہی جان ڈالتے ہیں۔ ہیرو کو challenge کرتے ہیں، انہیں مشکلات میں ڈالتے ہیں۔ جس سے ہیرو بہت مشقت سے یا سحر و ساحری / تعویز سلیمانی کی مدد / کسی غیبی مدد/wise old man کے مشورے سے باہر نکلتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہیرو کبھی ہمت نہیں ہارتا، آخری سانس تک جنگ کرتا ہے، پریشانیاں برداشت کرتا ہے صحرا نوردی کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ویلن بھی آخری سانس تک ہیرو کے کام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں یہاں تک کے موت آ جائے یا پھر بے بس ہو جائیں"

ویلن بھی۔ یہ کردار اپنی ہوس کی تسکین کے لیے چار مرتبہ ایک ہی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح "گلگامش" بھی ہے جو حسن پرست ہے، جس کا خوف ہر طرف پھیلا ہوا ہے لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کو اپنی طاقت کے زور پر چھین لیتا ہے۔ اس قسم کی اور بھی کہانیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن میں ویلن کا کردار ہی کہانی کی جان ہوتا ہے اور وہی کہانی کا ہیرو بھی ہوتا ہے۔

دیگر مرد منفی کرداروں میں 'اوسیرس' کا ست (set)، اوڈیسی کا 'پولی فیمس' مہابھارت کا 'دریودھن'، رام چرت مانس کا 'راون' انطی گونی کا 'قریون' اوتھیلو کا 'ایاگو' paradise lost کا شیطان، فاؤسٹ کا میفسٹوفیلس اور اردو داستانوں میں افراسیاب، نوشیرواں، صنعت، افات، لقا، سالوس، خسیسہ، شمس جادو، اور دیگر عیار ہیں۔ یہ بدی کسی خوف یا خواہش سے مجبور ہو کر نہیں کرتے بلکہ اپنا ذاتی و اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور

علی الاعلان کرتے ہیں۔

داستانوں میں مردانہ منفی کرداروں کی مانند نسوانی منفی کردار بھی اہم ہیں ۔ ان میں بھی تقریباً وہی اوصاف موجود ہوتے ہیں جن سے مرد حضرات متصف ہیں۔جس طرح مرد کرداروں کی فعالیت ہے اسی طرح عورتوں کی کہانیوں میں بھی بہترین منفی کردار مل جاتے ہیں۔قدیم عالمی ادب میں جہاں male negative characters ملتے ہیں، وہیں female negative character بھی موجود ہیں۔ کہانیوں کو دلچسپ بنانے میں یہ بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔رزمیہ ایلیڈ کی ''ایفروڈائٹ'' ہومر کا یہ منفی زنانہ کردار اس لیے اہم ہے کیوں کہ troy کی جنگ کی بنیادی وجہ یہی تھی۔اوڈیسی کے منفی کرداروں میں اگر چہ یولی فیس سب سے زیادہ اہم کردار ہے لیکن کرئی (circe) جادوگرنی، کلسپو دیوی (calyposo)۔اس کے علاوہ چھ گردنوں والی سکلا (چڑیل) اور اس کی بہن کابڈس بھی اہم ہیں۔اس قسم کی بہت سی عورتیں ملیں گی جن کے کردار کہانیوں کو دلچسپ بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں یا کم از کم challange دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اردو کی سب سے اہم اور ضخیم داستان ''امیر حمزہ'' میں ویلن عورتیں بہت سی ہیں جن کی خباثت مردوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔حسیصہ، نور افشاں، تاریک شکل کش، ملکۂ فرعونیہ کی ساحرہ ملکہ دمامہ اور ملکہ یاقوت خندان ایسے کرداروں کی بہترین مثالیں ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''داستان میں عورتوں کی حیثیت بہت پیچیدہ اور غیر معمولی ہے۔سحر وساحری اور عیاری میں وہ مردوں کے ہم پلہ ہیں۔ بلکہ بعض اوقات مردوں سے بڑھی ہوتی ہیں۔افراسیاب کی وزیر اول صنعت سحر ساز بہت زبردست ساحرہ ہے۔دیگر ساحراؤں میں مجلس جیسی نوعمر لڑکی ہے جو مردوں کو بلاشبہ تگنی کا ناچ نچاتی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے حجرۂ ہفت بلاؤں میں سے ایک بلا ''تاریک شکل کش'' کو پوری داستان کا خونخوار ترین کردار قرار دیا ہے جو بہت بڑی ساحرہ ہے۔یہ صورت کے اعتبار سے بھیانک ہے دشمن کو سیدھا پھاڑ کھاتی ہے۔اس کی آمد کی خبر سے نا صرف لشکرِ اسلام بلکہ افراسیاب کے لشکر میں بھی دہشت پھیل جاتی ہے۔ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں:

''ویلن کردار کے اعمال ان کی صورت سے زیادہ ڈراونے ہوتے ہیں۔تاریک شکل کش زندہ انسانوں کو کھاتی ہے اور کھانے کا انداز بھی مکروہ۔ایک نوجوان کو پکڑ کر گھسیٹا اور کھانے لگی۔ہڈیاں تک چبا جاتی ہے۔اس نوجوان کی چیخیں اور کراہیں اسے ذرا بھی متاثر نہیں کرتیں۔

(بحوالۂ شہناز کوثر، اردو داستانوں کے منفی کردار، ص:53)

خود افراسیاب کہتا ہے:

''دائی اماں کا سحر نہیں قہر سامری و جمشید ہے.... جس کو پکڑیں گی چیر پھاڑ کر کھا جائیں گی۔حقیقت میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے جو ہاتھ سے تاریک کے مارا گیا وہ اصل مرا۔'' (طلسم ہوش ربا جلد ششم، ص 172)

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو:

''فوت ہے ہم سب کی جان کو، تاریک شکل کش ملک الموت ہے ساحر نامدار آرام خوار اس کے ہاتھ سے بچنا دشوار ہے حقیقت میں وہ ملعونہ بلائے روزگار ہے'' (ایضاً)

تاریک شکل کش کا کردار وحشیانہ ہے اس کی صورت و سیرت حرکات وسکنات تمام کریہہ ہیں اس کے حلیہ کے متعلق لکھا ہے:

''دیونی سیہ فام بچا کی خالہ پردۂ ظلمات کی نشانی کلوا کی نانی لنگا بہت بھاری کالی کالی صورت اس پر چیچک کے داغ صاف ظاہر ہیں بال کھلے ہوئے برگد کی داڑھی کے مثال آنکھیں غار مہیب صورت عجیب وغریب دونوں ہاتھ ٹیکے ہوئے زبان منہ سے نکلی ہوئی باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے دیکھ کر قلب کانپتا ہے۔خوف ہے طائرِ روح قفس جسم سے نہ نکل جائے.... خال چہرۂ شب قد ملعونہ تاڑ کا درخت دل مثل سنگ سخت و کرخت جب ڈکار لے کر سر اٹھایا منہ سے دھواں نکل کر آسمان پر پہنچا گویا ابر دھواں دھار چھا گیا شراب کے مٹکے پیتی ہوئی، بجائے گزک ران بھینسے کی ہاتھ میں لیے اس کو چباتی ہوئی باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے لختے خون کے سینے پر جمے ہوئے گویا صفحۂ سنگ سیاہ پر سرخ جانور بیٹھے ہیں۔''

(طلسم ہوشربا، جلد ششم، ص 176)

اس کے علاوہ اس داستان میں ایسی عورتیں بھی موجود ہیں جو عشق و عاشقی کے معاملات میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں انھیں دریغ نہیں یہاں تک کہ قتل وغارت پر بھی آمادہ ہیں:

''عشق و عاشقی کے معاملات میں عورتیں اکثر پہل کرتی ہیں اکثر وہ اپنے منظورِ نظر کی خاطر اپنے والدین خاص کر

باپ کا قتل کرادیتی ہیں یا باپ کو خود ہی قتل کرڈالتی ہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، ساحری شاہی صاحب قرانی)

تاریک شکل کش کی مانند ملکِ فرعونیہ کی ساحرہ ملکہ دمامہ جادو، یہ سحر و ساحری میں بھی ماہر ہے اور کریہہ الصورت بھی ہے۔ صورت میں تاریک شکل کش کی مانند ہے۔ یہ جب میدان میں آتی ہے تو چار ہاتھیوں پر اس کا ہوج ہوتا ہے جس پر سوار ہوکر سات سو اژدہے کو وہ آتش فشاں سامنے سے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ علم نجوم سے بھی واقف ہے اس لیے لشکرِ اسلام سے مقابلے پر نہیں آتی۔ کیونکہ اس نے اپنے علم کے ذریعہ معلوم کرلیا تھا کہ تیس دن اس پر بھاری ہے اور وہ ان ایام کے گذر جانے تک خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

ملکہ یاقوت تخن دان بھی ایک بلا ہے۔ اس کے پاس جادو کی نہریں ہیں اور جب وہ میدان میں آتی ہے تو اس کے جادو کی دو نہریں ایک ساتھ چلتی ہیں اور رزم گاہ میں پھیل کر دشمنوں کو غرق کردیتی ہیں۔ ان نہروں میں مچھلیاں بھی ہوتی ہیں جو دشمنوں پر حملہ ور ہوتی ہیں۔ ملکہ یاقوت تخن دان کا اہم طلسم اس کا عفریتِ طلسمی ہے جو دشمنوں کو پھانک جاتا ہے۔ اس پر بڑے بڑے ساحروں کا طلسم بھی اثر انداز نہیں ہوتا، اس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ بلا کی حسین ہے اور افراسیاب اس سے شادی کا خواہشمند بھی ہے۔

امیر حمزہ کے علاوہ اردو کی دیگر داستانوں میں بھی خواتین کے منفی کردار نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو کی منظوم کہانیوں میں بھی خبیث عورتوں کے قصے ہیں لیکن امیر حمزہ کے کرداروں کے مقابلے میں مختلف قسم کے ہیں البتہ ایسے بہت سے کردار دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن میں معشوق کو حاصل کرنے کی چاہت انھیں ہر جائز و ناجائز کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ محبوب کو قید کرتی ہیں البتہ اس وقت تک انتظار کرتی ہیں جب تک کے رضامند نہ ہوجائے ہیرو بھی تمام مشقتیں تو برداشت کرتا ہے لیکن کسی طور راضی نہیں ہوتا ہے۔ آخر میں وہ شکست کھا کر ذلیل ہوتی ہیں۔ ان میں حسد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اپنے محبوب کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔ اس قسم کے واقعات منظوم کہانیوں میں عام ہیں۔ ایسے کردار امیر حمزہ کے کردار سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان میں عام زندگی کی جھلکیاں عشق کی کامیابی و ناکامی، ان کا غم و غصہ صاف نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ کہانیوں میں کٹنیاں ہوتی ہیں جو راز چرانے کا کام کرتی ہیں۔ یہ بہت ہوشیاری سے دشمن سے راہ و رسم رکھتی ہیں اور ان کی ہمدرد بن کر اپنے مدعا تک پہنچتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک کردار ''باغ و بہار'' میں بھی ہے۔ ''یہ بڑھیا شیطان کی خالہ'' بہت ہی عیاری اور مکاری کے ساتھ شہزادی فرنگ کی تلاش میں نکلتی ہے:

''کٹنی کے پیشہ کی مثالی عیاری اور سماج میں اس کی ایک مسلمہ حیثیت اس کی گفتگو کے پورے انداز اور اس گفتگو کے لفظ لفظ میں چھائی ہوئی ہے'' (ہماری داستانیں، ص:85)

کہانیوں کے اچھے کردار عموماً شہزادی، ملکہ، نیک بخت ہوتے ہیں جب کہ برے کردار کی عورتیں چڑیل، کٹنی، جادوگرنی، بدبخت، شیطان کی خالہ، وغیرہ سے جانی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی کردار ہوتے ہیں جو بظاہر نیک ہوتے ہیں لیکن حرکتیں بری ہوتی ہیں۔ یہ کردار مثالی نہ ہوکر انسانی زندگی سے قریب نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ انھیں اپنی غلطیوں پر پشیمانی بھی ہوتی ہے، اور یہ ہیرو کی مدد پر بھی آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہ کردار اصل میں نفس لوامہ کے زمرے میں آتے ہیں لیکن اصل منفی کردار ان عورتوں کا ہوتا ہے جو علی الاعلان قتل و غارت کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہمیں انھیں کاموں کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ غرض برائیاں فخریہ انجام دیتے ہیں۔ ایسے کردار ہی نفس امارہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے منفی کردار ہی نفس مطمئنہ رکھنے والے کرداروں کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ انھیں کردار کی وجہ سے اچھے کرداروں کے لیے قارئین و سامعین کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے اور منفی کردار ہی ہیرو کو مزید مشکلات میں ڈالتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کی جواں مردی اور ذکاوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ غرض منفی کردار داستان کے لیے اتنے ہی ناگزیر ہیں جتنا کی ہیرو کا کردار۔ رہی بات خواتین کی تو داستانوں کی دلچسپی کو دوبالا کرنے کے لیے عورتوں کے منفی کردار کو کہانیوں میں جا بجا پیش کیا گیا ہے بلکہ بعض دفعہ تو کہانی کے منفی کردار کی حیثیت کسی عورت کی ہوتی ہے تو بعض دفعہ معاون کی ہوتی ہے یا پھر کہانی میں معرکہ اور فساد کی بنیادی وجہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا قطعی غلط نہیں ہوگا کی عالمی داستانوی ادب ہو یا اردو داستانوی ادب میں نسوانی منفی کردار ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ان کرداروں کے بغیر داستانیت مفقود ہوجائے گی اور داستان کی بنیادی خصوصیت یعنی دلچسپی کا عنصر باقی نہیں رہے گا۔

□□□

Rayees Fatema

CV-3, Sector-23

Raj Nagar

Ghaziabad201002(U.P)

ٹیگور اقبال اور انسان دوستی

ثمرین

ٹیگور اور اقبال دونوں ادیب بہت عظیم ہیں اور ان میں کسی قسم کا تقابلی مقابلہ کرنا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ کیونکہ دونوں کے ادبی اظہار کا وسیلہ الگ الگ زبانیں تھیں یہاں تک کہ ٹیگور کی کوئی بھی تصنیف اردو زبان میں نہیں ہے، اس کے برعکس اقبال اردو اور فارسی زبان کے شاعر تھے لیکن مختلف زبانوں کے باوجود بیسویں صدی میں ہندوستان کی جن عظیم شخصیتوں نے فنی بصیرت، تعمیری انداز فکر اور انسان دوستی کے جذبات سے تمام عالم کو متاثر کیا اُن میں رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کا نام قابل احترام ہے۔ ان دونوں ادیبوں کا عہد تقریباً ایک ہی تھا لیکن تہذیبی اقدار، ادبی رویہ اور عقائد کے معاملے میں مختلف ہوتے ہوئے بھی ذہنی و فکری اعتبار سے یکساں تھے۔ ٹیگور کی فکر کی سمتیں بھی ان مقامات کو چھوتی ہیں جو اقبال کے افکار کی اہمیت کی حامل ہیں۔ ٹیگور کی فکر کا مرکز و محور محبت ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

> ''انسان کی آزادی اور نجات محبت میں ہے جو شعور اکمل کا دوسرا نام ہے۔''

(اقبال اور انسان، از اشفاق حسین، ص:58)

اقبال کی طرح وہ بھی ترکِ دنیا کے قائل نہیں ہیں۔ کائنات میں انسان ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ انسانوں سے باہمی ربط اور رشتۂ محبت استوار کرنے ہی میں انسان اور انسانیت کی فلاح ہے۔ اقبال اپنی نظم ''نیا شوالہ'' میں محبت کے گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

''ٹیگور اور اقبال کی شاعری کا ایک اہم موضوع انسان دوستی ہے۔ دونوں شعرا کے نزدیک تہذیبی معیار یہ ہے کہ اس میں انسانی فضیلت کو اہمیت حاصل ہو۔ معاشرے میں جب تک فرد کی اہمیت کو قبول نہیں کیا جائے گا تب تک معاشرہ مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے کے قابل نہیں ہو گا۔ ٹیگور اور اقبال اس نظریے پر قائم رہے کہ انسان کی عظمت ساری کائنات سے بلند ہے اور کسی بھی قوم و ملّت کی ترقی انسان کی ترقی کے بنا پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کے ذریعہ فلسفہ انسانیت کا جو تصوّر پیش کیا ہے اسے ہم انسانی خوشی یا مسرت سے تعبیر کر سکتے ہیں''

اس نظم میں جہاں وطن سے محبت کا اظہار ہے، شاعر کی نظم وطن سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ساری دھرتی کے باسیوں سے پریت یعنی محبت

کا مطالبہ کرتی ہے۔اقبال کا سفر محدود سے لامحدود، وطن اور مذہب سے انسانیت کی جانب ہے۔اقبال کے اسی نظریے کو ٹیگور نے اپنی نظم ''پرواسی'' میں اس طرح بیان کیا ہے، جس کا ترجمہ ہے:

''میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں انسانوں سے محبت کی ہے۔اسی تصور نے میری کشتیٔ حیات کے بادبانوں میں خوشگوار ہواؤں کی طرح حرکت پیدا کی ہے.....''

(رابندر ناتھ ٹیگور شاعر اور دانشور، مرتبین: وہاج الدین علوی اور پروفیسر شہزاد انجم، ص:268)

ان سطور سے ٹیگور کا نہ صرف تصور وطنیت ظاہر ہوتا ہے بلکہ یہ انسان دوستی کی ضامن بھی ہے۔ٹیگور اور اقبال کی شاعری کا ایک اہم موضوع انسان دوستی ہے۔دونوں شعرا کے نزدیک تہذیبی معیار یہ ہے کہ اس میں انسانی فضیلت کو اہمیت حاصل ہو۔معاشرے میں جب تک فرد کی اہمیت کو قبول نہیں کیا جائے گا تب تک معاشرہ مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ٹیگور اور اقبال اس نظریے پر قائم رہے کہ انسان کی عظمت ساری کائنات سے بلند ہے اور کسی بھی قوم وملت کی ترقی انسان کی ترقی کے بنا پروان نہیں چڑھ سکتی۔ٹیگور نے اپنی شاعری کے ذریعہ فلسفہ انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اسے ہم انسانی خوشی یا مسرت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ٹیگور اپنے شعری مجموعہ ''سونارتری'' میں لکھتے ہیں:

''انسان میرے دل کے قریب پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے بیدار کیا ہے، میں نے ان لوگوں کے سلسلے میں سوچا، کام کیا، کئی فرائض سامنے آئے اور ان فرائض سے آج بھی میرا خیال بچھڑا نہیں ہے۔انسان سے قریب آنے پر میری زندگی میں ادب کا راستہ اور میرے کام کا راستہ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔''

(ایضاً، ص:269)

ٹیگور کی اسی انسان دوستی اور اخلاقی پیغام نے پوری کائنات کے انسانوں کو متاثر کیا۔انھوں نے تنگ نظری، مذہبی کٹرپن، نفرت اور فرقہ پرستی کی شدید مخالفت کی اور تمام عمر ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھائی۔وہ ہمیشہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں انسان کی ترقی کی بات کرتے ہیں اور انسان کو اعلیٰ مقام پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔اقبال کی فکرِ روشن میں بھی انسان لامحدود صلاحیتوں کا مالک ہے اور وہ اپنے اندر کائنات کو سمو سکتا ہے۔جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک فارسی شعر میں کہا ہے:

آنچہ در آدم بہ گنجد عالم است
آنچہ در عالم نہ گنجد آدم است

(یعنی انسان کائنات کو اپنے اندر سمو سکتا ہے مگر کائنات انسان کو اپنے اندر نہیں سمو سکتی)۔

انسانیت سے عاری ادب کو ٹیگور بے معنی کہتے ہیں۔عام انسان کی زندگی اور مظاہر فطرت پر ان کی گہری نگاہ تھی۔انسان کی تکلیف، دُکھ درد اور پریشانیوں کا احساس ان کی تخلیقات میں انسان دوستی و دل دردمندی کی آواز بن کر اُبھرتا ہے۔وطن، انسان اور کائنات سے متعلق ان کے افکار اور دردمندی محض ان کی تخلیقات سے ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کی عملی زندگی میں بھی یہ پیغامات قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ٹیگور کی انسان دوستی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے ترقی پسند تحریک کے نام جاری پیغام میں کیا تھا:

''ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو اُمید اور مسرّت کا پیغام سنائے اور کسی کو نا اُمید اور ناکارہ نہ ہونے دے.....قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگند، جب تک ہر انسان نہ کھائے گا، اُس وقت تک دُنیا کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا''۔(ایضاً، ص:134)

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب میں بھی صرف انسان کے تعلق سے ہی بات کرنا پسند کرتے تھے اور ادیب کی ذمہ داری بھی یہی سمجھتے تھے کہ ادیب انسان کی بہبودی کے لیے لکھے۔ٹیگور انسانیت اور انسانی سماج کا ایک ایسا تصور رکھتے تھے جس میں جغرافیائی حدود کا کوئی دخل نہیں تھا خواہ انسان کسی بھی دیس پردیس سے تعلق رکھتا ہو۔مذکورہ خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ٹیگور نے ایک ایسی تعلیم گاہ ''شانتی نکیتن'' قائم کی جس میں مختلف زبانوں کے علوم، ادب اور فنون لطیفہ کی تعلیم وتربیت کی سہولتیں دستیاب تھیں۔اس تعلیم گاہ کے اصول و ضوابط عالمِ انسان کو پیش نظر رکھتے ہوئے متعین کیے گئے تھے۔جس کا مقصد مختلف تہذیبوں کی آمیزش سے ایک مشترکہ تہذیب کا تصور تھا۔

ٹیگور نے زندگی سے کبھی آنکھیں نہیں چرائیں بلکہ تمام مشکلات کا سامنا کیا۔اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کو وہ خوبصورت اور عوام کو خوش باش دیکھنا چاہتے تھے، اسی کام کو انجام دینے کے لیے انھوں نے اپنے قلم کو صرف کیا۔ٹیگور اپنی ذات کو دوسروں سے علیحدہ نہیں مانتے تھے بلکہ لوگوں کے سکھ دُکھ میں برابر کے شریک رہتے اور ان کی راہنمائی کرتے تھے۔جب بھی کہیں انسان کی بے قدری اور محنت کش کی بے عزتی ہوتی ہوئی نظر آتی تو وہ تلملا اُٹھتے تھے۔انھیں یہ احساس ہوتا کہ گویا یہ میری اپنی بے عزتی ہو رہی ہے۔وہ انسانیت کے پجاری تھے۔بقول ٹیگور:

''انسان کی ذات پر مجھے پورا بھروسہ ہے، سورج کی طرح وہ

بادلوں میں ضرور بوجھل ہوسکتا ہے لیکن بُجھ نہیں سکتا میں مانتا ہوں اس وقت جب تمام دنیا میں توپیں گرج رہی ہیں، شیطنیت کا ڈنکا بجتا ہوا نظر آتا ہے......لیکن میں تو اُس مستقبل کا منتظر ہوں جب انسان ،انسان کے ساتھ محبت کی ڈور میں بندھ جائے اور ملک و وطن اور قوم و نسل کے امتیاز مٹ جائیں گے۔اور جب انسان ''میں'' اور ''تم'' کے بدلے اپنے آپ کو ''ہم'' کہہ کر پکارا کرے گا۔''

(رابندر ناتھ ٹیگور فکروفن کے ہزار رنگ ،مرتبین: وہاج الدین علوی اور پروفیسر شہزاد انجم ،ص102)

ہمیں ٹیگور کی شاعری اور کہانیوں میں ہر جگہ ایک مشاہدہ بین دماغ کی کارگزاری نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنی تحریر میں انسانی جذبات واحساسات اور زندگی سے متعلق مختلف پہلوؤں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری حیرت میں پڑ جاتا ہے۔انسانی تحفظ کا دھیان رکھنے والا ٹیگور سے زیادہ بہ مشکل ملے گا۔ ٹیگور عوام کو زمانے کی تیز رفتاری کے ہمراہ چلنے کی تلقین کرتے تھے ان کے نزدیک ہر انسان کو زمانے کے دوش بدوش چلنا اور آگے بڑھنا ہے تاکہ کوئی کسی سے پیچھے نہ رہ جائے۔اس ضمن میں ان کی ترجمہ شدہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چلو آگے چلو آگے چلو آگے مرے بھائی
سفر میں زندگی کے قافلوں سے پیچھے رہ جانا
جو سچ پوچھو تو جیتے جی ہے گویا موت کا آنا
فقط جی جی کے مرجانا نہیں مقصد ہے جینے کا
ہے جینا نام جامِ آرزو بھر بھر کے پینے کا
چلو آگے چلو آگے چلو آگے مرے بھائی

درج بالا اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیگور ہر ایک انسان کی بلندی اور عظمت کے قائل تھے۔وہ زندگی اور اس کے مختلف ادوار کی تیز رفتاری کے ساتھ چلنے پر تمام لوگوں کو آمادہ کر رہے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ اگر زندگی کے سفر میں اپنے قافلے سے پیچھے رہ گئے تو گویا ایک طرح سے ہماری موت واقع ہوگئی،اور اِس کا نام زندگی نہیں بلکہ جیتے جی مرجانا ہے۔

ٹیگور نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں نسوانی کردار کو بھی اہمیت دی ہے۔انھوں نے بیشتر افسانے عورت کے متعلق تخلیق کیے ہیں جس میں عورت کی اخلاقی قدروں،اہمیت نیز شوہر اور گھر کے تئیں مختلف پہلوؤں و ذمہ داریوں کو اجاگر کیا ہے،ساتھ ہی وہ عورت کو پڑھا لکھا بھی دیکھنا چاہتے تھے اور خواتین کی پڑھائی کے حق میں تھے۔انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ عورت کے عظیم درجے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے برعکس جہاں تک اقبال کی شاعری میں انسان کے مقام ومرتبہ کے تعین قدر کی بات ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی پوری شاعری کا ماحصل انسانیت کا احترام اور عظمت ہے۔اس کو اقبال نے ایک شعر میں اس طرح ظاہر کر دیا ہے:

آدمیت ؟ احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

(انسان کا مقام آسمان سے بھی برتر ہے۔انسان کا احترام ہی اصل تہذیب ہے)

شعر را مقصود اگر آدم گریست
شاعری ہم وارثِ پیغمبریست

(اقبال)

انسان کا یہ مقام اقبال کے افکار کا ایک جزو ہے جس میں انسانی شخصیت اور اس کی بقا کے لامحدود امکانات ،عظمت اور عروج کو اولیت حاصل ہے۔اقبال نے انسان کے مقام کو برتر از گردوں کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان ہی وجہ تکوینِ کائنات ہے یعنی اس کائنات کی تخلیق کا سبب انسانی وجود ہے اور اب انسان خدا سے سوال کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ یارب تو نے مجھے دنیا میں اپنی مرضی سے بھیجا تھا لیکن اب تو میرے واپس آنے کا انتظار کر، کیوں کہ یہ جہان بہت بڑا ہے اور مجھے بیشتر کارہائے نمایاں انجام دینے ہیں:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے ،اب مرا انتظار کر

اقبال کی نظر میں تمام انسان ایک ہی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور وہ ہے نسلِ آدم کا رشتہ اور ہر وہ انسان جو خدا کے ہونے پر یقین رکھتا ہے بلندتر روحانی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ٹیگور کی طرح اقبال کے یہاں بھی حب الوطنی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے،انھوں نے ابتدا کی بیشتر نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر تخلیق کی ہیں،جن میں ''ترانہ ہندی''،''نیا شوالہ''،''ہمالہ''،اور''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''وغیرہ اہم ہیں۔اقبال کی شاعری کی ابتدا وطن کی محبت اور قومی اتحاد واتفاق کے ترانوں سے شروع ہوئی۔انھیں اپنے وطن کے ہر پھول ،پتے، پرند، انسان،دریا، پہاڑ،زمین،آسمان ہر شے کے حسن وخوبی کا احساس ہے۔ ان سب کا بیان وہ بڑے جذبے اور جوش کے ساتھ کرتے ہیں۔اسی کے ساتھ وطن کی زبوں حالی،غلامی اور پستی کا احساس اور درد بھی ان کے دل میں بہت شدید

ہے۔ پھر جیسے جیسے ان کا کلام پختہ ہوتا گیا ان کا پیام بھی عالمگیر ہوگیا۔ انسان دوستی کے شدید جذبے نے ہی اقبال سے ان اشعار کی تخلیق کرائی ہے۔ لکھتے ہیں:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے دہقاں ذرا
دانہ بھی تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کیوں کسی کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ بھی تو، راہ رو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

ٹیگور اور اقبال دونوں شعرا ایک دوسرے سے میلوں دور فاصلے پر زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان کے دل کی ہر دھڑکن میں ہندوستان کی آزادی اور حبّ الوطنی کا جوش اپنے عروج پر تھا۔ ان کے خمیر میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ایسی رچ بس گئی تھی کہ وہ ہمیشہ وطن کی محبت میں مدہوش رہے۔ فراق گورکھپوری ٹیگور کے متعلق لکھتے ہیں:

''ٹیگور کا پورا کارنامہ بہت ضخیم اور وقیع ہے۔ انھوں نے تین ہزار سے زیادہ نظمیں کہی ہیں جن کے مصرعوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ تک پہنچے گی۔ ان کی ہر نظم میں ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستان کے قالب کو ہم سانس لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کی مٹی بول اٹھتی ہے۔ ان نظموں میں ہندوستان کے کھیتوں کی لہلہاہٹ ہے، یہاں کے دریاؤں کا سازِ روانی ہے... ان کی شاعری میں ہمیں صرف مظاہرِ فطرت کی سینکڑوں بولتی ہوئی تصویریں نہیں ملتیں بلکہ ہمیں اس شاعری میں ہر منظر کا دل دھڑکتا ہوا دکھائی اور سنائی دیتا ہے۔''

(رابندر ناتھ ٹیگور فکر وفن، مرتبین: پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر شہزاد انجم، ص 532)

اقبال نے انسانیت کے تصور کو خودی سے تعبیر کیا ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں خودی کے فلسفے کو اہمیت دیتے ہوئے انسان کی انا اور خودی کے متعلق بہت ساری نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جس میں اقبال نے خودی کو پہچاننے اور اس کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی تلقین کی ہے۔ بقول اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

''خودی'' کا لفظ اقبال کے پیغام میں تکبر و غرور یا اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک خودی نام ہے احساس غیرت مندی کا، جذبہ وخودداری کا، حرکت و توانائی کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا۔ فرد اور ملت کی ترقی و پستی خودی کی ترقی و زوال پر منحصر ہے۔ خودی کا تحفظ زندگی کا تحفظ اور خودی کا استحکام، زندگی کی پائیداری ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک خودی کی کارفرمائی ہے۔

اقبال کو جدید تعلیم یافتہ طبقے سے خصوصاً جوانوں سے یہ شکایت ہے کہ ان کے ذہن مرعوبیت کا شکار اور ان کے افکار فرنگیوں کی مانند ہیں۔ نہ ان کی اپنی کوئی سوچ ہے نہ رائے۔ نئے انکشافات و ایجادات کی قوت ختم ہوتی جارہی ہے اور تقلید کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ بے یقینی اور بے دینی نے نوجوانوں کو اپنی گرفت میں اس حد تک جکڑ لیا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار میں انھیں کوئی عار نہیں اور اس فکر کے اعلان میں انھیں کوئی باک نہیں۔ ''ضربِ کلیم'' میں ''افرنگ زدہ'' کے زیرِ عنوان نئی نسل کو اس طور پر مخاطب کرتے ہیں:

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اقبال نے اپنے فلسفہ حیات میں بنیادی حیثیت قوتِ عمل کو دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ طاقتور ہی اپنے ماحول کی تخلیق کرسکتا ہے جبکہ کمزور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اقبال کا بیان ہے کہ:

''جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج کل کے نوجوان آدمیت کے باب میں گستاخ و بے ادب ہو رہے ہیں تو میرا دل کڑھتا ہے، سینے میں عجیب طرح پیچ و تاب پیدا ہوتا ہے۔ حضورؐ کے اخلاقِ حسنہ کی یاد آجاتی ہے اور ملت کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ اے کاش نئی نسل، آدمی کے مقامِ محمود سے باخبر ہوتی اور احترامِ آدمیت کا حاصل جانتی۔''

(اقبال سب کے لیے، از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص 494)

نوجوان نسل سے شکایت ہونے کے باوجود اقبال کو نوجوانوں پر یہ اعتماد بھی تھا کہ نوجوان ہی ان کی آرزوؤں کے چراغ اور اُمیدوں کے آفتاب و مہتاب ہیں، ان کی روشنی آج دھیمی سہی کل تیز ہوگی اور مستقبل کی راہیں اس سے جگمگا اٹھیں گی۔ اسی ضمن میں ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

انسان کی عظمت اور اس کی لاتعداد صلاحیتوں کا احساس اقبال کو مخمور کردیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ گاہے بگاہے خدا کی شان میں بے باکی اور

خدا سے اکثر و بیشتر نوک جھونک کی مثالیں اقبال کی شاعری میں موجود ہیں:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اقبال کی نظر میں دنیا نسلِ آدم سے آباد ہے اگر انسان نہ ہوتے تو یہ جہاں روشن نہیں ہوتا اور یہی حقیقت ہے۔ اقبال کے یہاں نئی نسل کا ایک اور نام ہے اور وہ ہے ''شاہین''۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً اسی نام سے مخاطب کیا ہے، اس لیے کہ ایک نوجوان میں وہ جس قسم کے مردانہ صفات دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ انھیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ (شاہین ایک پرندہ ہے جو خوددار اور غیرت مند ہے، دوسروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، کبھی آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز اور تیز نگاہ ہے)۔ چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

نئی نسل سے اقبال کی خوش آئند اُمیدوں کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بچوں اور نوعمروں کے لیے لکھی تھیں جو ''بانگِ درا'' کے حصہ اول کی زینت ہیں۔ یہ نظمیں گویا اس پیغام کی تمہید ہیں جو اقبال نئی نسل کو دینا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لیے تقریباً وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر کوئی شخص اپنی خودی کو استوار کرسکتا ہے۔ ان نظموں میں 'پرندے کی فریاد'، ''ماں کا خواب''، ''پہاڑ اور گلہری''، ''ایک گائے اور بکری''، اور ''ایک مکڑا اور مکھی'' قابلِ ذکر ہیں۔

جس طرح اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ تمام عوام خصوصاً مسلم قوم کو بیدار کیا اور مسلمانوں کی عظمت و بلندی کے لیے سعی و پیہم کرتے رہے اس طرح کی کوشش ہمیں ٹیگور کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ ٹیگور برہمو سماج سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ خود کو لامذہب کہتے تھے، وہ مذہب پر یقین نہیں رکھتے تھے اور بغیر کسی مذہب کی تقلید کے وہ انسان کو انسان سمجھتے تھے اور اسی کو مساوات اور اعلیٰ مقام دلانے کے قائل تھے۔ بقول ٹیگور:

''میرے کردار اور عملی زندگی میں ہندو اور مسلمان میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔ دونوں پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے مساوی طور پر شرمندہ ہوتا ہوں۔ ہندو اور مسلمان میں ہر قسم کی فرقہ پرستی کو باعث شرم سمجھتا ہوں۔''

(رابندر ناتھ ٹیگور شاعر و دانشور، ص: 102)

ٹیگور اگر چاہتے تو انسانیت کے لیے یہ تمام اقدام مذہبی رہ کر بھی کرسکتے تھے مگر وہ مذہب کو انسانی ترقی میں غالباً رکاوٹ جانتے ہوں گے یہ ان کی ذاتی سوچ تھی لیکن اقبال نے اپنی اکثر و بیشتر تخلیقات میں مسلم قوم کو مخاطب کیا ہے اور وہ اپنی قوم کو درخشاں و تابندہ دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اس سے ایک اور پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ٹیگور صرف انسانیت کے شیدائی تھے، وہ ہر تخلیق میں مذہب سے پرے ہٹ کر صرف انسانیت کی بات کیا کرتے تھے، ان کی نگاہ میں کوئی بھی مذہب کسی اعتبار سے کمتر درجے کا حامل نہ تھا۔ اس لیے وہ مذہب سے علیحدہ ہو کر سارے کام انجام دیتے تھے اور تمام عوام کو ایک دوسرے کے قریب دیکھنے کے قائل تھے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اقبال نے صرف مسلم قوم کے لیے لکھا، بلکہ وہ بھی تمام ہندوستانیوں کو دوسرے ممالک کی طرح ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔

مختصر یہ کہ دونوں ادیبوں کی تصانیف میں جذبہ انسانیت اور حب الوطنی، قوم پرستی، باہمی اتحاد اور قومی یکجہتی کے جذبات کی کمی نہیں ہے۔ دونوں ادبا ظلم، بربریت، مفلسی کے دکھ، حکمرانوں کے جبر کے خلاف ہم آواز تھے۔ دونوں ایک ایسی جنت آباد کرنا چاہتے تھے کہ جہاں دلوں میں کوئی خوف وہراس نہ ہو، انھیں اعتماد تھا کہ انسانیت کی بقا کا راز احترام انسانیت میں ہے۔ دونوں کی عظمت عبارت ہے اس جذبے سے جو ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے فکر و نظر کی پوری صداقت کے ساتھ کوشاں رہا جہاں خیر و شر کی جنگ میں خیر کی جیت ہو۔

□□□

Samreen
P.3 , Street No. 8
Batla House
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

مسرور جہاں

ماں

کال بیل بجی۔ دامنی نے لپک کر دروازہ کھولا۔ پاپا کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ دامنی نے ان کے ہاتھ سے سبزی کا تھیلا لے لیا انھوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تھکن سے نڈھال آہستہ قدموں سے پلنگ کی طرف بڑھ گئے۔ دامنی نے جلدی سے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھا دیا اور اندر سے ان کی چپلیں لا کر ان کے پاؤں کے قریب رکھ دیں۔ سرویش نے پیار سے بیٹی کو دیکھا پانی پی کر گلاس بیٹی کو تھما دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ بیوی نظر نہیں آرہی تھی۔ کچن میں ہوگی سوچ کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

دامنی نے سبزی کا تھیلا ماں کو پکڑایا اور کہا۔

'پاپا آگئے ہیں ممی'۔

ارونا نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ تھیلا ناگواری سے پکڑا جیسے اس میں سبزی نہیں کیڑے مکوڑے ہوں۔

'ارونا؟'۔ سرویش نے پتنی کو آواز دی۔ وہ کچن سے باہر آئی۔ تیکھا ناک نقشہ، گورا رنگ، سرخ ساڑی ہم رنگ بلاؤز، گلے میں منگل سوتر، کلائیوں میں لال ہری چوڑیاں، پاؤں میں چھن چھن کرتے گھنگروں والے چھلّے، سر سے پاؤں تک سہاگن کا مکمل اشتہار۔ اس کے مقابلے میں سرویش بجھا ہوا کوئلہ لگتا تھا۔ دبلا پتلا بدن، جھکے ہوئے شانے، سینہ دھنسا ہوا، ڈھیلے ڈھالے ہاتھ پاؤں، تھکا تھکا انداز بنا بنایا کلرک۔ ہیڈ کلرک تھا تو کون سے سرخاب کے پر لگ گئے تھے۔ ازلی خطاب 'کلرک' تو اس کی ذات سے پیوست تھا اور اس خطاب کا اس کی ذات سے الگ ہونے کا برسوں پتہ نہیں تھا۔

سرویش نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر اسے تھما دی۔ ارونا کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ جانتی تھی وہی بندھی ٹکی تنخواہ ہوگی نہ ایک روپیہ کم نہ زیادہ۔ جیسے وقت کا پہیہ ایک جگہ رک گیا ہو بلکہ جام ہوگیا ہو۔ کیا مجال جو کسی مہینے ذرا سا گھوم جائے۔ سرویش بھی ہر ماہ پیسے دیتے وقت کچھ نہیں کہتا تھا۔ نہ کسی اضافہ کی خوش خبری نہ ترقی کا مژدہ۔ بھلا ایسی رکی تھمی زندگی بھی کسی کی ہوگی۔ یکساں بور اور تھکی ہوئی۔

ان کی شادی کو بائیس سال ہوگئے تھے۔ دامنی بیس برس کی تھی اور بی اے فرسٹ ایئر میں تھی۔ بیٹا امریش اٹھارہ سال کا تھا اور ابھی انٹر فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ باپ کا خواب تھا کہ بیٹا ڈاکٹر بنے۔ لیکن ایک کلرک کی تنخواہ سے ڈاکٹری کا خواب پورا ہوتا تو ملک کا ہر دوسرا لڑکا ڈاکٹر بن جاتا۔ ارونا کا اولادوں کو لے کر کوئی خواب نہیں تھا۔ جیسا چل رہا تھا ٹھیک تھا۔ البتہ اپنے بارے میں وہ بہت حساس تھی۔ اچھا لباس، زیورات، فیشن، گھومنا پھرنا۔ لیکن اس کی اڑان ایک حد تک ہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی مالی حیثیت کو دیکھتے ہوئے چست اور درست رہتی تھی اس کا لباس بھی اچھا ہوتا تھا۔ بھلے اسے دو کے بجائے ایک ہی سبزی کیوں نہ بنانی پڑے۔ اسے اپنی محرومی کا شدت سے احساس تھا اور سرویش سے ڈھیر ساری شکایتیں تھیں۔ اول تو یہ کہ وہ اسے سرے سے پسند نہیں تھا۔ نہ پرسنالٹی اچھی تھی نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ ایک لباس تین دن تک پہنے رہتا۔ نہ استری کا ہوش نہ لباس کی سلوٹوں کا خیال۔ سرویش اور مردوں کی طرح دھلے ہوئے استری

شدہ کپڑوں کی فرمائش نہیں کرتا تھا۔ ارونا کو بھی آرام تھا۔ اس کی بلا سے وہ پورے ہفتے ایک لباس پہنے۔ اسے تو بس مہینے کے مہینے نوٹوں کی گڈی سے واسطہ تھا جو وہ بغیر گنے الماری میں رکھ دیتی تھی۔ جانتی تھی کمی بیشی کا سوال نہیں تھا۔ اس کا حساب بھی نپا تلا تھا۔ راشن، بجلی کا بل، گیس، بچوں کی فیس اور کالج کے اخراجات۔ دامنی کا بس کا کرایہ، امریش سائیکل سے کالج جاتا تھا۔ سرویش کا اسکوٹر کے پٹرول کا خرچ، آفس میں روز ایک کپ چائے کی فضول خرچی، کپڑے کون سا روز بنتے تھے۔ زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی۔ بہت اچھی نہیں تو بہت بری بھی نہیں تھی اور شاید یوں ہی چلتی رہتی اگر سرویش کا ایکسیڈنٹ نہ ہوا ہوتا۔ اچانک ہی زندگی میں اتھل پتھل پیدا ہوگئی۔

اس دن آفس سے واپسی میں سرویش کا اسکوٹر ایک کار سے ٹکرا گیا۔ گاڑی والا کوئی شریف انسان تھا جو بھاگنے کے بجائے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا یہ بھی معجزہ ہوگیا کہ ہڈیاں سلامت رہیں۔ بس پنڈلی اور کہنی میں چوٹیں آئی تھیں وہ بھی زیادہ خراش نہیں تھیں۔ بس ڈریسنگ اور پین کلر کے بعد ڈاکٹر نے انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ اسکوٹر کار کی ڈگی میں رکھا گیا اور اسے آرام سے پچھلی سیٹ پہ لٹا دیا گیا اور وہ اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئے۔

امریش کالج سے آچکا تھا۔ دامنی پہلے ہی آگئی تھی۔ بھائی بہن پریشان تھے۔ باپ کے آنے میں کبھی اتنی دیر نہیں ہوتی تھی۔ ارونا کچن میں کھانا تیار کررہی تھی۔ کھانا جلدی کھا لیا جاتا تھا۔ جلدی کھانا جلدی سونا یہ سرویش کا معمول تھا۔ بچے البتہ پڑھائی کی وجہ سے جاگتے تھے۔ ارونا بھی کام نپٹا کر سو جاتی تھی۔

کال بیل کی آواز پر امریش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ وہ پاپا کے آنے کی راہ دیکھ رہے تھے ان کی بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر امریش نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔

’میرا نام رانا ہے۔ تم امریش ہونا۔ مسٹر سرویش کے بیٹے؟‘

’جی۔ لیکن آپ؟؟‘ امریش نے پوچھا۔

’سرویش صاحب کے چوٹ آگئی ہے۔ دراصل ایکسیڈنٹ میری ہی کار سے ہوگیا تھا۔ لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہے بھگوان کی کرپا سے کوئی فریکچر وغیرہ نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے۔ آؤ ان کو گاڑی سے اتار لائیں۔ انھیں بس آرام کی ضرورت ہے۔‘

رانا نے تسلی دی۔ لیکن امریش کی گھبراہٹ کم نہیں ہوئی۔ وہ لوگ کرسی پر بٹھا کر سرویش کو اندر لائے اور انھیں بیڈ پر لٹا دیا۔ رانا نے دواؤں کا

’ارونا پتی کی حالت دیکھ کر سخت پریشان تھی اسے سرویش سے عشق نہ سہی لیکن انسیت تو تھی۔ رشتے کی اہمیت سے تو اسے انکار نہیں تھا اور ساتھ رہنے سے جو ایک بے نام سا لگاؤ ہو جاتا ہے وہ بھی اہم تھا۔ وہ جی جان سے پتی کی سیوا میں لگ گئی۔ سرویش نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا جو بہت سندر تھا‘

لفافہ امریش کو تھما دیا اور نسخہ کے مطابق دواؤں کے بارے میں سمجھایا۔

’پہلے سرویش صاحب کو ہلکا گرم دودھ دو پھر دوا دینا۔ اس کے بعد کھانا دے سکتے ہو کوئی پرہیز نہیں ہے۔‘

’اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔‘

رانا صاحب نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور سرویش کے تکیے کے پاس رکھ دی۔ سرویش نے تڑپ کر کہا۔

’رانا صاحب یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ پلیز اسے اٹھالیں۔‘

’دیکھیں سرویش صاحب۔ پتہ نہیں ابھی کتنے دن آپ کا علاج چلے گا۔ میرا فرض ہے کہ اپنی لائی ہوئی مصیبت میں آپ کا ساتھ دوں۔‘ رانا نے بڑے خلوص سے کہا۔

سرویش نے سختی سے انکار کردیا۔ باپ کا اشارہ پا کر امریش نے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر ان کی جیب میں رکھ دی۔ مجبوراً رانا نے ان کی بات مان لی۔

ارونا پتی کی حالت دیکھ کر سخت پریشان تھی اسے سرویش سے عشق نہ سہی لیکن انسیت تو تھی۔ رشتے کی اہمیت سے تو اسے انکار نہیں تھا اور ساتھ رہنے سے جو ایک بے نام سا لگاؤ ہو جاتا ہے وہ بھی اہم تھا۔ وہ جی جان سے پتی کی سیوا میں لگ گئی۔ سرویش نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا جو بہت سندر تھا۔

دوسرے دن شام سے پہلے رانا صاحب حاضر تھے۔ اس شان سے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں شاپر تھے جو انھوں نے بہت اصرار سے امریش کے حوالے کیے۔ وہ سب سے اتنے پیار، انکسار اور اپنائیت سے پیش آئے کہ کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب کی زبانیں بند ہو

گئیں۔ رانا کے لائے ہوئے سامان سے ناشتے کی ٹرے بھر گئی۔ رانا ڈھیروں سامان لے آئے تھے اور ان کے اخلاق نے سب کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ روز شام کو ان کے گھر آنے لگے۔ کبھی کبھی تو وہ رات کا کھانا بھی انھیں کے ساتھ کھاتے تھے۔ بالکل فیملی ممبر کی طرح سب سے گھل مل گئے تھے، وہ کوئی نوعمر انسان نہیں تھے سرویش کے ہم عمر ہی ہوں گے یا سال دو سال زیادہ ہی ہوں گے۔ البتہ کھاتے پیتے خاندان کے تھے اس لیے صحتمند تھے۔ خوش مزاج اور دریا دل تھے۔ اب گھر میں کسی کو ان سے غیریت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رانا صاحب کی وجہ سے سب کا رہن سہن بھی بدل گیا تھا۔ سرویش بھی اب پریس کے کپڑے پہنتا تھا۔ صرف کپڑوں کی بات نہیں تھی۔ رانا کی خوش مزاجی نے سب کو ہنسنا اور مسکرانا سکھا دیا تھا۔ وہ لوگ کئی بار رانا کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے بھی گئے۔ ان کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ انھیں خوش رہنا اور جینا آ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ لوگ جیسی زندگی جی رہے تھے اسے جینا کون کہے گا۔ جاگنے کے وقت جاگ گئے، سونے کے وقت سو گئے، بھوک لگی، پیٹ بھر لیا، کالج چلے گئے نہ زندگی میں کوئی دلچسپی تھی نہ جینے میں کوئی مزہ تھا۔ ارونا کی بدمزاجی ہوا ہو گئی تھی۔ اب وہ رات کا کھانا خوب جی لگا کر بناتی تھی کیونکہ اکثر رانا صاحب وہیں کھانا کھا لیتے تھے۔ وہ کچن سے نکلتی تو نہا دھو کر دوسرا لباس پہن لیتی۔ کپڑوں سے مصالحوں کی بدبو نہ آئے اس لیے لباس بھی اچھے سینٹ سے مہکتا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ بھی کرتی تھی اور یہ اس کا پرانا شوق تھا۔ ایک دن رانا صاحب نے ہنستے ہوئے کہہ دیا۔

'مسز سرویش! آپ کہیں سے بھی دو جوان بچوں کی ماں نہیں لگتیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بڑی بہن کہہ لیں'۔

رانا صاحب نے تعریف کر کے اسے بہت بڑا اعزاز بخشا تھا۔ ہر عورت خاص طور پر جوان بیٹی کی ماں یہی تو سننا چاہتی ہے اور رانا عورتوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے۔ تب ہی تو انھوں نے ارونا کی تعرف کی تھی۔ اگر وہ ماں سے اس کی جوان بیٹی کی تعریف کرتے (جو ناممکن تھا) تو بات بننے کے بجائے بگڑ جاتی اور ماں بیٹی کی تعریف برداشت نہ کرتی اول تو وہ اسے بدمعاش سمجھتی جو اس کی جوان بیٹی پر بری نظر رکھتا ہے۔ دوسری اور اہم بات عورت کبھی اپنے مقابلے میں کسی دوسری عورت کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی خواہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی اولاد کے مقابلے میں اسے اپنی سبکی گوارا نہیں تھی۔ وہ سرویش کے سامنے اس کی موجودگی میں اس کے پکائے ہوئے کھانوں کی تعریف کرتے تھے اس کی نہیں۔ سرویش لاکھ شریف سہی مرد تو تھے۔ اسے رانا کا اس طرح گھر میں گھسا رہنا، تحائف لانا سخت ناپسند تھا لیکن اسے بیوی سے لڑنا جھگڑنا پسند نہیں تھا۔ شرافت اپنے آپ میں ایک قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ جس کا مقابلہ دنیا کے سارے خزانے مل کر بھی نہیں کر سکتے اور سرویش اس خزانے کا مالک تھا۔ اس نے شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ایک دن ارونا کو وہ خبر سنا دی جو اس کے لیے ایٹم بم سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں تھی۔ ٹرانسفر تو کب کا ڈیو تھا۔ وہی بچوں کی پڑھائی کا عذر پیش کرتا رہا تھا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ امریش اور دامنی نئی اور بہتر جگہ جانے کے خیال سے بہت خوش تھے۔ لیکن ارونا کسی صورت جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا یہاں جیسا سکھ اور کہاں مل سکتا تھا!

'سرویش کو جانا ہے جائے وہ اور بچے یہیں رہیں گے'۔

'تمھیں اکیلے رہتے ڈر نہیں لگے گا؟'۔ سرویش نے پوچھا۔

'ڈر کیا۔ پرانی جگہ ہے آس پڑوس سب رشتے داروں سے بڑھ کر ہے۔ پھر میرا بیٹا جوان ہے تو ڈر کیسا؟'

ارونا کی ضد سے کسی حد تک سرویش ہار مان چکا تھا کہ اچانک بازی پلٹ گئی اور ارونا پتی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ سرویش اس کی تولہ ماشہ طبیعت سے آگاہ تھا۔ اس نے پتنی کی بات پر یقین نہیں کیا......
لیکن ارونا نے صاف کہہ دیا۔

'دامنی اور امریش یہاں رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں اکیلی کیسے رہوں گی'۔

اور یہ بات ایسی تھی کہ کسی کو برا نہیں لگا۔ وہ ماں تھی۔ اسے ہر فیصلہ بچوں کا برا بھلا سوچ کر کرنا تھا۔ اب وہ یہ بات سب کو کیسے بتاتی کہ اس نے رانا کو خود کہتے سنا تھا کہ وہ اس کے گھر میں دامنی کے لیے آتے ہیں اور دامنی اس کی بیٹی تھی۔ کوئی غیر مرد اس کی تعریف کرے وہ سن لے گی وقتی طور سے خوش بھی ہو لے گی۔ لیکن ایک باپ کی عمر کا مرد اس کی بیٹی سے کہے کہ وہ اس کے لیے آتا ہے تو وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اسے رانا کی نیت کا حال معلوم ہو گیا۔ جبکہ نیت کا حال اوپر والے کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اوپر والے کے بعد صرف 'ماں' ہے جو مرد کی نظر اور نیت اچھی طرح پہچانتی ہے۔ وہ بھی ماں تھی۔

□□□

Masroor Jahan
C-1, 3rd Floor
Durga Devi Marg, Husainabad
Lucknow-226003 (U.P)

افسانہ

شاہین زیدی

گول گپے والا

ہزیرہ بانو کی بیٹی نہا نے ماں سے ضد کرتے ہوئے کہا...

"ممی آپ کو پتہ ہے کہ کلاس میں سب لڑکیوں نے میرا کتنا مذاق اڑایا جب انھیں پتہ چلا کہ میں نے آج تک گول گپے نہیں کھائے..."

"ذرا سوچیں آپ کی بیٹی کتنی شرمندہ ہوئی ہوگی"... "ممی بس آج تو آپ مجھے گول گپے کھلائیں گی تو میں گھر جاؤں گی... ورنہ ورنہ..."

ہزیرہ نے پیار سے بیٹی کے چہرے پر پڑی بالوں کی لٹ کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"ورنہ کیا کروگی"؟

"کچھ بھی نہیں... نہا نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

ہزیرہ بانو گاڑی اسٹارٹ کر کے گول گپے والے کی تلاش میں نکل پڑی۔ اسکول سے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹھیلے پر گول گپے نظر آئے جس پر وہ کھل اٹھی... نہا کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"بس اتنی سی بات تھی... وہ دیکھو سامنے گول گپے والا کھڑا ہے پہلے چکھ لو پسند آ گئے تو لے لیں گے"۔

نہا نے ماں کی بات سے اتفاق کیا۔ گول گپے والے کے گرد خاصا رش تھا۔ چھٹی کا وقت تھا، اسکول کے بچوں کی بڑی تعداد گول گپوں سے دو دو ہاتھ کرنے میں مصروف تھی۔

وہ للچائی نظروں سے بچوں کو گول گپے کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں سے لڑکپن شروع ہوتا ہے۔ گول گپے والا پلیٹ میں گول گپے اور پیالے میں کھٹا پانی لیے کھڑا تھا۔

ہزیرہ نے بیٹی کو طریقہ بتایا کہ گول گپے کس طرح کھاتے ہیں، گول گپے کو منہ میں رکھتے ہی اس کا چہرہ دیکھ کر میں اور گول گپے والا اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

وہ منہ بنا کر بولی۔

"او... ہو ممی یہ تو بہت کھٹا پانی ہے..."

ایسے میں مجھے بیٹی پر ٹوٹ کر پیار آیا... واقعی کھٹا پانی ہے... ذرا دوسرا گول گپا کھا کر بتاؤ...

نہا نے معصومیت سے پھر اسی طرح منہ بنایا...

میں نے ہنس کر کہا... "مجھے پتہ تھا کہ تم کھٹا نہیں کھا سکتیں تبھی تو میں نے تمھیں گول گپے نہیں کھلائے تھے... میں تمھاری ماں ہوں تمھاری پسند، ناپسند اور یہاں تک کہ تمھارے ذائقہ سے بھی آگاہی رکھتی ہوں... ٹھیک ہے ہم گول گپے نہیں لیں گے"۔

اس سے پہلے کہ میں گول گپے والے کو منع کرتی کہ ہم گول گپے نہیں لینا چاہتے...

نہا نے جھٹ سے میرے پیسے پرس سے نکال کر گول گپے والے کو تھماتے ہوئے کہا...

"سو روپے کے پیک کردو..."

میری حیرانگی کو دیکھتے ہوئے گول گپے والے کے جانے کے بعد وہ بولی۔

"ممی...!!! آپ حیران نہ ہوں۔ دراصل مجھے گول گپے والے پر رحم

نہا نے جھٹ سے میرے پیسے پرس سے نکال کر گول گپّے والے کو تھماتے ہوئے کہا۔۔

"سو روپے کے پیک کردو..."

میری حیرانگی کو دیکھتے ہوئے گول گپّے والے کے جانے کے بعد وہ بولی۔

"ممی...!!! آپ حیران نہ ہوں۔ دراصل مجھے گول گپّے والے پر رحم آگیا تھا، آپ نے دیکھا نہیں جب ہم گول گپّے چکھ رہے تھے۔ وہ کتنی حسرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا... یقیناً وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا ہوگا کہ مجھے گول گپّے پسند آجائیں تو بچارے کی دیہاڑی لگ جائے گی"۔

آگیا تھا، آپ نے دیکھا نہیں جب ہم گول گپّے چکھ رہے تھے۔ وہ کتنی حسرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا... یقیناً وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا ہوگا کہ مجھے گول گپّے پسند آجائیں تو بچارے کی دیہاڑی لگ جائے گی"۔

گول گپّے والے نے مسکراتے ہوئے گول گپّوں کا پیکٹ نہا کو تھماتے ہوئے کہا...

"یہ لیجیے میں نے سو روپے میں جتنے گول گپّے آتے تھے پیک کردیے، مگر کھٹے پانی کی قیمت وصول نہیں کی وہ میں نے اپنی طرف سے فری میں آپ کو زیادہ دے دیا ہے"۔

"شکریہ" نہا نے ادائے بے نیازی سے کہا اور میں نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھادی۔

گھر آکر میں نے نہا سے پوچھا...

"آخر اتنے سارے گول گپّے کیوں لے آئی ہو"۔

"گول گپّے والے کا میں دل توڑنا نہیں چاہتی تھی... آپ فکر نہ کریں گول گپّے میں کھالوں گی اور اس کا پانی ہم پھینک دیں گے"۔ نہا نے جواب دیا۔

وہ لباس تبدیل کرنے چلی گئی اور مجھے برسوں پہلے پیش آنے والا واقعہ یاد آگیا۔

میری پھوپھی جان اندرون شہر میں رہا کرتی تھیں۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں آباد گھروں کے باسی بہت سے کام کیا کرتے تھے۔ پھوپھی جان کے پڑوس میں آلو چھولے، فروٹ چاٹ، دال چاول، دہی بھلے اور گول گپّوں والے رہا کرتے تھے۔ یہ سب لوگ گھروں سے کھانے پینے کی اشیاء تیار کر کے اسکول، کالج اور دفتروں کے باہر ٹھیلے لگا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتے تھے۔

ان کے گھروں میں خواتین ٹافیاں، نمکین پیک کرتیں۔ پھوپھی جان جب ہمارے گھر آتیں تو ہمارے لیے چٹ پٹی مزے دار کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتیں۔

پھوپھی جان کے مقابلے میں ہم بہت اچھے علاقے میں رہا کرتے تھے۔ ہمارے والدین ہمیں کھٹی، میٹھی چیزیں خرید کر کھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے گھروں میں پھل اور بسکٹ یا پھر مٹھائی آیا کرتی تھی۔ رنگ برنگے چورن اور ابلے ہوئے چنے یا اسکول کے گرد بکتی چیزوں کو ہم صرف للچائی نظروں سے دیکھتے تھے کیوں کہ انھیں خریدنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔

شاذ و نادر ہی ہمیں پھوپھی جان، خالہ، ماموں، چچا جان کے گھر جانے کی اجازت ملتی کیوں کہ میرے والد صاحب بڑے اصول پسند انسان تھے۔ خاندان میں سب سے بڑے تھے لہٰذا وہ سب ہر موقع پر خود ہی ڈیڈی سے ملنے چلے آتے۔ کبھی ڈیڈی امی کو ساتھ لے کر خود ہی سب سے ملنے چلے جاتے۔ ہمیں بہت کم اجازت ملتی کہ ہم ماموں یا چچا کے گھر جا کر ایک دن رہ آئیں۔

ہمارا گھر خاندان کے سبھی گھروں سے بڑا تھا، ہم سب سے زیادہ خوشحال تھے۔ گھر سے اسکول دور تھا لہٰذا سرکاری اسکول کا مجبوراً انتخاب کیا گیا اور پھر اسکول جا کر ہمیں یوں لگا جیسے اسکول کی لڑکیاں ہم سے زیادہ بہتر ہیں۔

اسکول کی فضا مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔ میری ہم جماعت لڑکیاں مجھ سے خاصی بڑی تھیں۔ وہ استانی صاحبہ کو سویٹر بُن کر دیتیں، کبھی استانی جی کے بچوں کے کپڑے سیتیں کبھی دوپٹے کڑھائی کر کے دیتیں یوں ساری لڑکیاں استانی صاحبہ کی منظور نظر تھیں اور مجھے ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا آتا تھا سوائے پڑھائی کے جس سے میں استانی صاحبہ کی قربت حاصل کرسکتی۔

سرکاری اسکولوں کی بھی کیا بات تھی۔ سردیوں میں ساری استانیاں دھوپ تاپنے کے لیے اسکول کے صحن میں اکٹھی ہو کر سردی کم کرنے کے لیے مونگ پھلیاں کھاتیں اور مجھ جیسے بچے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے،

اسکول میں اچھی پوزیشن لیتے تھے استانی صاحبہ کی جگہ بچوں کو کھڑے ہو کر پڑھاتے یہاں تک کہ چھٹی کا وقت ہو جاتا...

پھوپھی جان گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو ساتھ لے کر ہمارے گھر رہنے کے لیے آ جاتیں تو ہماری عید ہو جاتی۔

ہمارے کزنز اور ہم سب بھائی بہنوں کی آپس میں خوب دوستی تھی۔ ہم سارا دن کھیل کود کر گزارتے۔ کبھی لوڈو، کیرم، تاش اور کبھی بیڈ منٹن کھیلتے۔

امی اور پھوپھی جان ہمیں لے کر چڑیا گھر، شاہی قلعہ، شالیمار باغ کی سیر کو نکل جاتیں۔ اس وقت کے بچوں کے لیے یہ تفریح کسی نعمت سے کم نہ تھی۔

مگر ہمارے مقابلے میں ہمارے بچوں کو کسی تفریح، کسی رشتے دار کزن، خالہ، ماموں، پھوپھی، چچا کو کسی سے بھی مل کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

آج کے بچے ہماری طرح چھوٹی چھوٹی بات پر خوش بھی نہیں ہوتے عجب طرح کے بچے ہیں... منہ بنائے ہوئے عید تہوار پر بھی خوش دکھائی نہیں دیتے۔

خیر پھوپھی جان بچوں کو لے کر واپس گھر جا رہی تھیں کہ میں رونے لگی پھوپھی جان کے جاتے ہی گھر خالی ہو جائے گا... میں یہی سوچ رہی تھی کہ پھوپھی جان کی بڑی صاحبزادی نے ہماری امی سے کہا۔

”ممانی جان ہر دفعہ ہم آپ کے گھر آ کر رہتے ہیں کبھی آپ لوگ بھی ہمارے گھر آ کر رہیں“۔ نہ جانے امی کو کیا ہوا کہ امی نے کہا...

”ٹھیک ہے تم ایسا کرو کہ ان بچوں کو ساتھ لے جاؤ دو تین دن یہ تمہارے گھر رہیں گے پھر میں انھیں لینے آؤں گی تو ایک رات تمہارے گھر رہوں گی... بتاؤ اب تو تمھیں کوئی گلہ نہیں...“

امی کی اجازت ملنے پر ہم سب بہن بھائی بہت خوش تھے اور اس ڈر سے کہ امی کا ارادہ نہ بدل جائے جلدی سے سامان اٹھائے پھوپھی جان کے گھر آ پہنچے۔

ہمارے گھر کی نسبت پھوپھی جان کا گھر بہت چھوٹا تھا مگر ہم بہت خوش تھے۔ یہاں ہر قسم کی آزادی تھی۔ ہر وقت کھیلنے بلکہ گھر سے باہر جانے، چھت پر جانے کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

ہم اپنی چند دن کی آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا جی بھر کر بدپرہیزی کی گئی۔ یہی نہیں بازار جاتے، سموسے کھاتے، بوتلیں پیتے اور خاص طور پر گول گپے کھاتے۔ پھوپھا جان اپنے بچوں کے ساتھ ہمیں بھی چیز کھانے کے لیے پیسے دیتے۔

اسکول کی فضا مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔ میری ہم جماعت لڑکیاں مجھ سے خاصی بڑی تھیں۔ وہ استانی صاحبہ کو سوئیٹر بُن کر دیتیں، کبھی استانی جی کے بچوں کے کپڑے سیتیں کبھی دوپٹے کڑھائی کر کے دیتیں یوں ساری لڑکیاں استانی صاحبہ کی منظورِ نظر تھیں اور مجھے ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا آتا تھا سوائے پڑھائی کے جس سے میں استانی صاحبہ کی قربت حاصل کر سکتی۔
سرکاری اسکولوں کی بھی کیا بات تھی۔ سردیوں میں ساری استانیاں دھوپ تاپنے کے لیے اسکول کے صحن میں اکٹھی ہو کر سردی کم کرنے کے لیے مونگ پھلیاں کھاتیں اور مجھ جیسے بچے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اسکول میں اچھی پوزیشن لیتے تھے استانی صاحبہ کی جگہ بچوں کو کھڑے ہو کر پڑھاتے یہاں تک کہ چھٹی کا وقت ہو جاتا...

ہماری پھوپھی جان کو گھر گھر پھرنے کی بری عادت تھی، ادھر پھوپھا جان دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکلے، اُدھر پھوپھی جان بھی محلے کی خبریں اکٹھی کرنے کے لیے نکل جاتیں...

ہماری بہنیں پھوپھی زاد بہنوں کی ہم عمر تھیں جلد از جلد گھر کے کام سے فراغت پا کر سر جوڑے جانے کیا باتیں کرتی رہتیں۔

ہمارے آتے ہی روز برابر والے گھر سے گول گپے آتے اور ہم لڑتے جھگڑتے خوب گول گپے کھاتے۔

ایک دن ہماری بہنیں کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، پھوپھی جان گھر پر نہیں تھیں۔ ایسے میں ہم چھت پر کھیل کود میں مشغول تھے کہ ڈیوڑھی میں شور ہوا...

آہستہ آہستہ لڑنے جھگڑنے کی آوازیں ہمارے کانوں تک بھی آ رہی تھیں۔ پہلے تو ہم بہت دیر تک چھت سے کھڑے نیچے صحن میں دیکھتے رہے پھر پھوپھی جان کی غصے بھری آواز سن کر نیچے آ گئے۔

"ہم اپنی چند دن کی آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا جی بھر کر بدپرہیزی کی گئی۔ یعنی نہیں بازار جاتے، سموسے کھاتے، بوتلیں پیتے اور خاص طور پر گول گپے کھاتے۔ پھوپھا جان اپنے بچوں کے ساتھ ہمیں بھی چیز کھانے کے لیے پیسے دیتے۔
ہماری پھوپھی جان کو گھر گھر پھرنے کی بری عادت تھی، ادھر پھوپھا جان دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکلے، اُدھر پھوپھی جان بھی محلے کی خبریں اکٹھی کرنے کے لیے نکل جاتیں۔۔۔
ہماری بہنیں پھوپھی زاد بہنوں کی ہم عمر تھیں جلد از جلد گھر کے کام سے فراغت پاکر سر جوڑے جانے کیا باتیں کرتی رہتیں۔

صحن میں سارے بچے سہمے کھڑے تھے اور پھوپھی جان کی منجھلی بیٹی سر جھکائے بیٹھی تھی، پھوپھی جان دو ہتھڑ اس کی کمر پر مارتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"کم از کم تو نے اس بدذات کی ذات ہی دیکھ لی ہوتی۔ جوانی تو ہم پر بھی آئی تھی... پر کم بخت تجھ جیسی جوانی کسی پر نہ آئے۔ میں بھی تو کہوں کہ مردوا چنگیریں بھر بھر کر گول گپے بھجوا رہا ہے...کوئی مفت میں کیوں کسی پر مہربان ہوتا ہے..."

"مجھے کیا خبر تھی کہ دو ٹکے کے گول گپوں کی خاطر تو میری ناک کٹوانے پر تلی ہوئی ہے... منحوس ماری تجھے ایسی جگہ بیاہوں گی کہ تو میری شکل کو ترسے گی..."

پھوپھی جان گلا پھاڑے جو جی میں آرہا تھا کہہ رہی تھیں اور ان کی بیٹی سر جھکائے پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ پھوپھی جان گول گپے والے کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر "اناپ شناپ" بولے جا رہی تھیں۔ ہم سب کو پھوپھی جان پر غصہ آرہا تھا۔

پھوپھی جان کے بیٹے نے کہا...

"پتہ نہیں اماں کو کیا ہو گیا ہے؟ غلطی باجی نے کی ہے اور یہ اس پر ناراض ہو رہی ہیں اس بیچارے کا آخر قصور کیا ہے؟ ہمیں اتنے سارے گول گپے کھلاتا ہے، کبھی ہم سے اس نے پیسے بھی نہیں لیے..."

"اماں کو اگر پیسے دینے پڑ جائیں تو یہ ہم پر گول گپے کھانے کی پابندی لگا دیں گی..."

کوسنے دیتے دیتے پھوپھی جان کو جانے کیا یاد آیا کہ انھوں نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا:

"تم یہاں کیا کر رہے ہو...؟ دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے دور کہیں۔ خبردار جو میں نے کسی بچے کو گھر سے باہر جاتا دیکھا تو ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گی..." پھر لڑکیوں کی طرف رُخ کر کے بولیں۔

"تمھاری باتیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتیں، گھر لٹ جائے، کوئی مر جائے، تمھیں اس سے کیا... تمھارے چٹخارے کیا اس گھر کی عزت سے بڑھ کر ہیں۔

چند دنوں بعد انھوں نے منجھلی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ سب نے ان کو بہت ٹوکا، لڑکی کم عمر ہے بھلا اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے پھر اس سے بڑی دو بہنیں بیٹھی ہیں... مگر ان کے پاس ہر بات کا یہی جواب تھا۔ اس کا جی پڑھائی میں نہیں لگتا... فالتو گھر بٹھانے کا کیا فائدہ..."

"بڑی بیٹیوں کے بھی جب رشتے آئیں گے تو انھیں بھی جلدی سے بیاہ دوں گی، یہ رشتہ اس کے لیے آیا تھا۔ بیٹیاں جتنی جلدی گھر بار کی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے... کچی عمر ہے سسرال والے جس رنگ میں رنگیں گے رنگی جائیں گی"۔

منجھلی آپی شادی کے بعد اپنے دولہا کے ساتھ ہنسی مسکراتی میکے آنے لگیں، بیٹی کو خوش و خرم دیکھ کر پھوپھی جان کا دل بھی صاف ہو گیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئیں کہ آپی نے اب اپنا گھر بسا لیا ہے۔ وہ شوہر کے ساتھ خوش ہے اور گول گپے کو بھلا چکی ہے۔

گول گپے والے نے ہمارے محلے والا مکان بیچ کر دوسری جگہ رہائش اختیار کر لی تھی۔ منجھلی آپی اور گول گپے والے کے درمیان کیا ہوا تھا کسی کو یاد نہیں مگر آج نبہا کے دل میں گول گپے والے کے لیے پیدا ہونے والی ہمدردی نے مجھے برسوں پہلے پیش آنے والے واقعہ کی یاد دلا کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

□□□

Shaheen Zaidi
Editor Quarterly 'Nawadir'
E-1, 266, Street No. 8
Jhelam Avenue, Wapda Town
Lahore (Pakistan)

نئی سائیکل.....!

ڈاکٹر رضوانہ پروین

عمر کا باونواں سال اور سائیکل کا ساتھ اب بھی ویسا ہی تھا جیسے پانچویں جماعت میں جانے کے بعد ابا سے ضد کر کے سائیکل خریدوائی تھی۔ابا نے پوچھا تھا کیا کرے گا؟؟ یہی نا کہ سائیکل کی گھنٹی بجا بجا کر سارے محلے میں دندنا تا پھرے گا ؟ ادھر اس کو ٹکڑ لگا دی، ادھر چکرا کر سائیکل گرائی۔آں بول....؟؟ مگر بچے تو بچے ہوتے ہیں انھیں کہاں کسی بات کی فکر ہوا کرتی ہے اور نہ ہی وہ زیادہ نفع نقصان پر غور کرتے ہیں۔ان کا تو بس جب جس چیز پر دل آیا اسے حاصل کرنے کے لیے مچل اٹھے۔ان دنوں مجو بھی ایسا ہی کھلنڈرا بچہ تھا اسے پڑھائی میں کم اور مختلف قسم کے کھیل کنکھوے اڑانے پتنگ بازی وغیرہ میں زیادہ دل لگتا تھا اور جب سے اس کے دوست رمیز کو اس کے ابا نے سائیکل لادی تھی تب سے مجو سائیکل کا دیوانہ ہو گیا تھا۔جب بھی رمیز کو سائیکل لیے دیکھتا وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیتا۔اکثر ایسا ہوتا رمیز سائیکل چلا رہا ہوتا اور مجو بھی اس کے پیچھے تو کبھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہوتا۔گھر سے اماں جب اسے ڈھونڈھتی ہوئی باہر گلی کے نکڑ تک آتیں تو انھیں یہ منظر دیکھ کر اپنے بچے کی محرومی کا اندازہ کر ان کا دل بھر آتا.....ہائے کیسے میرا لال ایک ذرا سائیکل چلانے کی چاہ میں اس نگوڑے کے آگے پیچھے چکر کاٹ رہا ہے ان کے دل سے ایک آہ نکلتی.......ہائے !وہ افسوس کر کے رہ جاتیں۔ہر ماں کو اپنے بچے کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔وہ ظاہری طور پر مجو کو ڈانٹتی ہوئی گھر میں لے آتیں لیکن اندر ہی اندر اپنی مجبوری اور بچے کے شوق کو دیکھ ان کا دل کڑھتا۔مجو کے ابا جو دفتری (لفافے بنانے) کا کام کیا کرتے تھے،تھوڑا کام وہ گھر پر بھی کرنے کو لے آتے جسے کرنے میں اماں خوش دلی سے ان کا ساتھ دیا کرتیں۔ایک شام کاغذ کا بنڈل کاندھے پر لیے گھر میں داخل ہوئے مجو کی ماں نے سہارا دے کر بنڈل کو اتارا پھر پانی کا گلاس شوہر کو دیتے ہوئے بولیں ’’اجی ،سائیکل بڑی مہنگی ہوتی ہے کیا؟؟ مجو کے ابا نے جواب دینے سے قبل بیوی کی طرف گہری نظر سے دیکھا ....اور پوچھا ’’تم ای سوال کا ہے پوچھ رہی ہو۔اب کا ہم ای عمر میں سائیکل چلاوے سیکھیں گے...؟‘‘ ’’ارے نہیں جی، او ہم آپ لگی تا (آپ کے لیے نہیں) مجوا کے لیے سوچ رہے تھے،دوسرے لڑکن کے ہاتھ میں سائیکل دیکھ مجوا ان کے ساتھ بھاگتا پھرتا ہے.....کا ہم کچھ پیسہ ملا کر اپنے بچوا کے لیے سائیکل نہیں لا سکتے؟؟ بیوی کی بات پر مجوا کے ابا نے کچھ سوچا اور بولے۔بچپن میں ہی میرے ابا گزر گئے۔شوق ہم کو بھی تھا لیکن ہم کس کو کہتے ،اس زمانے میں سائیکل بڑکن لوگوں کے گھر میں ہوا کرتی تھی۔خیر! اس نے گہری سانس لی اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا’اب سائیکل غریب کے پاس بھی ہوتی ہے۔ دام تو ہم کو معلوم نہیں ،لیکن کل مال دینے بازار جا رہے ہیں پتا کر آئیں گے۔ دوسرے ہی ہفتے مجو کے لیے اس کے ابا نے سائیکل خرید لی۔سائیکل پا کر مجو پھولے نہ سماتا مانو اسے دنیا کی سب سے قیمتی شئے مل گئی ہو۔

ایک دن مجو کے ابا بازار سے انگور خرید کر اور کچھ کاغذ کے بنڈل

"اب مجو پر پوری طرح سے ذمہ داری آن پڑی تھی ۔وہ باپ کے بتائے دفتر میں جاتا کچھ دیر وہاں کام سیکھتا پھر گھر لوٹ آتا ۔کام سیکھنے کے دوران پیسے تو ملتے نہ تھے ،وہ مایوس ہوتا تو اماں اسے سمجھاتیں "بیٹا کام سیکھ لے ،کل کو ہنر ہی کام آئے گا" مجو جب اپنے ہم عمر ساتھیوں کو اسکول جاتے اور کھیلتے دیکھتا تو تھوڑی دیر یوں راستے میں انہیں حسرت بھری نظروں سے تاکا کرتا۔اب وہ اسکول نہیں جاتا تھا اور کام پر لگ گیا تھا"

ہاتھ میں لیے گھر کو آرہے تھے کہ راستے میں ایک ٹیمپو نے ٹکر ماردی اور ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ۔ یہ حادثہ مجو اور اس کی ماں کے لیے قیامت صغرا سے کم نہ تھا۔گھر میں ایک ہی کمانے والا تھا تین بچے جن میں گیارہ سالا مجو ایک چھوٹا بھائی شفیق اور بہن نوری کے درمیان اچانک سے اور بڑا ہو گیا۔ چاہتے ناچاہتے فکر اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ ابا کھٹیا پر پڑے افسوس کے سوا کیا کر سکتے تھے ۔ مجو کو پاس بلاتے کچھ جگہوں کا پتہ سمجھاتے اور پیسوں کے تقاضے کے لیے بھیج دیتے۔شروع میں یوں کچھ پیسے آتے رہے اور گزر بسر ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے گھر کے خرچ اور علاج کے لیے پیسوں کی آمد بند ہوگئی۔ مجبوری میں مجو کی اماں پاس پڑوس کے دو چار گھروں میں صاف صفائی کا کام کرنے لگ گئیں ،یوں دو وقت کی روٹی کا انتظام تو ہو جاتا لیکن مناسب علاج نہ ہونے کے سبب مجو کے ابا کا پیر ٹھیک نہ ہوسکا اور اپنی لاگر زندگی کا بوجھ وہ زیادہ دنوں تک نہ ڈھوسکا اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔

اب مجو پر پوری طرح سے ذمہ داری آن پڑی تھی ۔ وہ باپ کے بتائے دفتر میں جاتا کچھ دیر وہاں کام سیکھتا پھر گھر لوٹ آتا۔کام سیکھنے کے دوران پیسے تو ملتے نہ تھے ،وہ مایوس ہوتا تو اماں اسے سمجھاتیں "بیٹا کام سیکھ لے ،کل کو ہنر ہی کام آئے گا!" مجو جب اپنے ہم عمر ساتھیوں کو اسکول جاتے اور کھیلتے دیکھتا تو تھوڑی دیر یوں راستے میں انھیں حسرت بھری نظروں سے تاکا کرتا۔ اب وہ اسکول نہیں جاتا تھا اور کام پر لگ گیا تھا۔

کچھ برسوں بعد گھر کے حالات بہتر ہونے لگے تھے مجو اب ٹھیکے پر کام لینے لگا تھا۔ چھوٹے بھائی شفیق کو بھی ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ شفیق کو سائیکل کے آگے ڈنڈے پر بٹھائے پیچھے کیریئر میں کاغذ کے گتے دبائے مگن میں سائیکل چلاتا دفتر کو چلا جاتا ۔اب نہ بچپن تھا نہ شوق فقط ذمہ داریاں تھیں ۔ پھر بھی وہ مطمئن کام میں مگن رہتا۔ بھائی کو ابا کی کمی محسوس نہ ہونے دیتا۔ نوری گھر میں سلائی کڑھائی کے ساتھ ساتھ قرآن اور دینی کتابوں کی تعلیم مکمل کر چکی تھی ۔اب اماں کو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ستانے لگی تھی ۔اماں نے باہر کا کام چھوڑ دیا تھا اور بیٹی کے ساتھ اس کی سلائی کے کام میں مدد کرتیں اور ملنے جلنے والوں سے بیٹی کے رشتے تلاشنے کا التماس کرتیں۔

مجو کی عمر کے اکیسویں سال میں اماں نے اس کی شادی اپنی بہن کی لڑکی سے کرادی۔ مجو کے اوپر ذمہ داری مزید بڑھ گئی تھی ،لیکن وہ خوش تھا۔ روز شام گھر لوٹتے وقت کچھ پھل اور مٹھائیاں خرید لاتا۔ آج اس نے برفی خریدی تھی اور بڑی خوشی خوشی اپنی بیوی کو دیتے ہوئے بولا "یہ برفی تمھارے لیے .....چوراہے کے دکان کی بہت مشہور ہے ،خالص میوے کی...دوسرے ہاتھ سے پھل کی پولیتھین آگے کرتے ہوئے بولا لو اماں کو دے آؤ آم دھوکر کاٹیں گی۔ مجو اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش تھا۔ بہت جلد اس کے گھر نئے مہمان کی آمد ہونے والی تھی ۔وہ کام میں اور زیادہ دھیان اور وقت دینے لگا تھا۔ اوور ٹائم کرنے لگا تھا تا کہ آنے والے وقت کے لیے پیسے اکٹھا کر سکے۔ ایک دن تاخیر سے گھر لوٹنے پر بیوی نے سوال کیا" آج آنے میں اتنی دیر کیسے کردی؟ وہ مسکراتا ہوا بیوی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کے ابھرے پیٹ پر دھیرے سے لگاتے ہوئے بولا "ان کے لیے" اور دونوں ہنس پڑے۔ میں نے تمھاری زچگی کے خرچ کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کر دیے ہیں ۔تم کو گاؤں نہ جانے دیں گے۔ ہمارا بچہ یہیں شہر میں پیدا ہوگا پرائیویٹ اسپتال میں ۔ مجو کی بات سن کر اس کی بیوی مسرور ہوگئی اور شوہر کے کاندھے سے اپنا سر ٹکا کر اس سے پیار سے لپٹ گئی۔ اس کے پیار بھرے لمس کو مجو نے محسوس کیا۔

صبح مجو ناشتہ کر کے کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا.....اس کی بیوی نے کہا 'اجی آپ اسکوٹر کیوں نہیں لے لیتے ہیں سائیکل پر اتنا سامان لے کر روز جاتے ہیں' پہلے تو مجو خاموش رہا پھر گویا ہوا' اسکوٹر اگر شوق کے لیے لینا ہوتا تو لے چکا ہوتا ،لیکن اب مجھے شوق نہیں ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں!' مجو کے اس سنجیدہ جواب پر اس کی بیوی آگے کچھ نہ بول سکی۔

بڑھتی مہنگائی، بڑھتا خاندان اور بڑھتے اخراجات کے ساتھ ساتھ ایک انسان کی زندگی کس ڈگر پر گزرتی ہے اس کی بہترین مثال مجو کی زندگی

تھی۔اب اس کا بیٹا تین سال کا ہو چکا تھا۔اگلے سال سے اس کے اسکول میں داخلے کی تیاری بھی کرنی تھی۔ہر دن کے خرچ سے کچھ پیسے کاٹ کر اماں بیٹی کے جہیز کے لیے کچھ سامان مہیا کرتی رہیں۔زندگی یوں اپنی ڈگر پر چل رہی تھی اور مجو ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ لیے آج بھی اس سائیکل پر سوار تھا۔بہن کی شادی طے پائی ،لڑکے والوں نے چالیس ہزار نقد کی مانگ کی علاوہ اس کے ایک اسکوٹر اور سلائی مشین بھی۔ان اشیا کے انتظام میں مجو اور اس کے بھائی کی کل آمدنی بھی کم پڑ رہی تھی ، پھر بھی جیسے تیسے ،جہیز کا انتظام کیا گیا اور خیر سے ،بہن رخصت ہوئی۔

مجو کو اب بھائی کی عمر کا خیال تھا اس کی شادی بھی کر دینی چاہیے۔اماں سے ایک دن اس نے کہا تو بولیں 'بیٹا ابھی اتنا خرچ ہوا ہے ،ایک دو برس رک کر کرتے ہیں ایسی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے ...... پوتے کو دلار کرتے ہوئے بولیں اب تو میں دادی ساس بننے کا خواب دیکھوں گی۔اس بات پر مجو اور اس کی اماں دونوں ہنس پڑے۔ننھا دلاور ان دونوں کو ہنستا دیکھ دادی سے بولا ''دادی اماں ہم کو بھی بہو لا دو'' دلاور کی بات پر ماں بیٹے کی ہنسی مزید تیز ہو گئی۔مجو بیٹے کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولا ہاں لا دیں گے بیٹا تمھاری بہو بھی لا دیں گے۔کیسی بہو چاہیے تم کو؟؟ دلاور جھٹ سے بولا

ماں کے جنازے کو کاندھوں سے لگائے مجو اس خیال میں گم تھا کہ یہ ذمہ داری کا بوجھ ہے یا فرض! ماں اور باپ دونوں کے سائے سے اب وہ محروم ہو گیا تھا ....اب وہ خود کو صحرا کی تپتی ریت میں ننگے سر محسوس کر رہا تھا۔ ماں کا وجود اس کی زندگی میں ایک گھنے مضبوط درخت کا سا تھا جس کی چھاؤں میں آتے ہی اس کی دن بھر کی تھکان اتر جایا کرتی تھی۔ہر پریشانی کو اماں کیسے خود جھیل لیا کرتیں اور ہم بھائیوں کو پر سکون و مطمئن کر دیا کرتیں.....اب وہ کس کے آگے اپنے دکھ درد سنائے گا وہ پھپھک پڑا۔

''لال والی''۔ان لوگوں کے ہنسنے کی آواز سن کر مجو کی بیوی بھی وہاں آ گئی اور بیٹے کی بات سن کر وہ بھی ہنس پڑی۔

اگلے ہی سال شرفو کی شادی بھی سادگی سے انجام پا گئی۔دلاور اسکول کی دوسری جماعت میں تھا۔مجو کی بیوی پھر امید سے تھی اماں اب بیمار رہنے لگی تھیں۔نوری کا شوہر اخلاق مند نہ تھا، وہ نہ خود سسرال آتا اور نہ نوری کو جانے کی اجازت دیتا اماں بیٹی کو بہت یاد کرتیں۔دو فرمانبردار بیٹوں اور بہوؤں کی موجودگی کے باوجود ان کا دل بیٹی میں اٹکا تھا۔وہ بار بار نوری! نوری! کی رٹ لگاتیں شفیق سے اماں کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی....وہ صبح والی ٹرین سے بہن کو لینے بستی پور نکلا اور اسے لے کر شام ڈھلتے گھر لوٹا۔اماں کی مانو جان ہی بیٹی میں اٹکی تھی۔نوری آتے ہی اماں سے لپٹ کر زار و قطار رو پڑی ماں بیٹی کی لمبی جدائی کے بعد ملاقات جو ہو رہی تھی ماں بیٹی کے ملن کا منظر دیکھ کر سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔اماں کو جیسے ازلی سکون مل گیا ہو۔اس رات ایسا سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

ماں کے جنازے کو کاندھوں سے لگائے مجو اس خیال میں گم تھا کہ یہ ذمہ داری کا بوجھ ہے یا فرض! اماں اور باپ دونوں کے سائے سے اب وہ محروم ہو گیا تھا....اب وہ خود کو صحرا کی تپتی ریت میں ننگے سر محسوس کر رہا تھا۔ماں کا وجود اس کی زندگی میں ایک گھنے مضبوط درخت کا سا تھا جس کی چھاؤں میں آتے ہی اس کی دن بھر کی تھکان اتر جایا کرتی تھی۔ہر پریشانی کو اماں کیسے خود جھیل لیا کرتیں اور ہم بھائیوں کو پر سکون و مطمئن کر دیا کرتیں.....اب وہ کس کے آگے اپنے دکھ درد سنائے گا وہ پھپھک پڑا۔

اماں کے چہارم کے اگلے دن مجو روزانہ کی طرح سائیکل اٹھائے پیچھے کیریئر میں کاغذ کے گتے باندھے کام پر جا رہا تھا۔اب سائیکل بھی بوسیدہ ہو کر مجو کے سر کے بالوں کی طرح بے رنگ اور بے جان ہو گئی تھی۔وہ نئی سائیکل کے جگاڑ میں لگا تھا اور نئی ذمہ داریاں اس کے تعاقب میں۔

□□□

Dr. Rizwana Perween
D/o Mohammad Anwar
Alamganj Peerwais Market Maidan
Post: Gulzarbagh
Dist: Patna- 800007 (Bihar)

انتظار

ادا فاطمہ

"آفس سے آنے کے بعد بازار کا کھانا کھاتے ہوئے جیت تین منزلہ گھر کی بالکنی میں کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا جہاں سامنے والے گھر میں آنٹی اپنے اوپن کچن میں کھڑی پرجوش سی کچھ بنا رہی تھیں۔ ان کے گھر کی بڑی سی کھڑکی، جو ہمہ وقت کھلی ہوتی تھی، اس کی بالکنی کے بالکل سامنے تھی۔ اس میں سے ان کا کچن، بائیں طرف کے کمرے کا دروازہ اور دائیں طرف کے ایک اور کمرے کے دروازے سے تھوڑا ہٹ کر بنا باہری دروازہ صاف نظر آتا تھا"

جیت کو اس محلے میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا لیکن سامنے والا گھر اب تک اس کے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔ اس گھر میں دو بزرگ رہتے تھے۔ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کے یہاں ہر وقت خاموشی چھائی رہتی تھی۔

بوڑھے انکل گم صم سے باہر کے کام نمٹایا کرتے جبکہ آنٹی روزمرہ کے کاموں سے فراغت کے بعد زیادہ تر گھر کی کھڑکی سے لگی باہر کے نظارے دیکھا کرتی تھیں۔ دودھ والے، دھوبی اور اخبار والے کے آنے یا انکل کی بازار سے واپسی پر وہ کھولنے کے لیے تیز قدموں سے دروازے کی طرف جایا کرتی تھیں لیکن دروازہ کھولنے کے بعد دکھ میں لپٹی ہوئی ایک عجیب سی مایوسی ان کے چہرے پر جھلکنے لگتی۔ وہ آنے والے سے خواہ مخواہ ہی الجھ پڑتیں۔ کم از کم جیت کو تو یہی محسوس ہوتا تھا۔

جیت نوکری کی وجہ سے گھر والوں سے دور تھا۔ اس شہر میں کرائے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ آفس جانے کی تیاریاں کرتے وقت اور واپسی پر اس کی نظریں بے ساختہ سامنے والے گھر کی طرف اٹھ جایا کرتی تھیں۔ اتوار کو ہفتے بھر کے کام کاج، کپڑوں کی دھلائی، گھر والوں سے بات چیت کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے سامنے والے گھر کی طرف دیکھ ہی لیتا۔ ایسا نہیں تھا کہ دوسروں کے گھروں میں تاک جھانک کرنے کی اسے عادت تھی۔ وہ ایک شریف اور خاندانی لڑکا تھا۔ اس کے والدین نے اس کی عمدہ پرورش کی تھی لیکن وہ اس پراسرار گھر کے ان دو افراد کے عجیب و غریب رویے کی وجہ سے انھیں دیکھنے لگا تھا۔

آفس سے آنے کے بعد بازار کا کھانا کھاتے ہوئے جیت تین منزلہ گھر کی بالکنی میں کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا جہاں سامنے والے گھر میں آنٹی اپنے اوپن کچن میں کھڑی پرجوش سی کچھ بنا رہی تھیں۔ ان کے گھر کی بڑی سی کھڑکی، جو ہمہ وقت کھلی ہوتی تھی، اس کی بالکنی کے بالکل سامنے تھی۔ اس میں سے ان کا کچن، بائیں طرف کے کمرے کا دروازہ اور دائیں طرف کے ایک اور کمرے کے دروازے سے تھوڑا ہٹ کر بنا باہری دروازہ صاف نظر آتا تھا۔

آج جیت نے آنٹی کو اتنے دنوں میں پہلی بار اتنا زیادہ خوش دیکھا تھا، ورنہ تو وہ ہر وقت کھوئی کھوئی اور اداس سی رہتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر جیت کو اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ اس نے کھانے سے فارغ ہو کر ماں کو کال لگائی جو جلد ہی ریسیو بھی کر لی گئی۔

> "آنٹی اطراف میں دیکھتیں، پھر گھڑی دیکھنے لگتیں۔ وہ کچھ بے چین سی تھیں۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد انکل بھی باہر آگئے اور آنٹی کو اندر لے جانے لگے لیکن وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔ وہ کسی طور پر اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ جیت نے جلدی سے بات ختم کی۔ اسے لگا، کوئی بات ہو گئی ہے"

'ہیلو ماں!...جیت بول رہا ہوں۔'

'جیت!...کیسا ہے تو؟' ماں نے بے تابی سے پوچھا۔

'بہت اچھا۔'

'وہ تو تو ہے ہی۔...یہ بتا، کچھ کھایا؟' ماں نے اپنا پسندیدہ جملہ کہا تو وہ ہنس پڑا۔

'ہاں، کچھ دیر پہلے ہی کھایا ہے۔' جیت نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

'باہر کا کچھ کھالیا ہوگا۔' ماں اداس ہوگئیں۔

ماں سے دوری کے خیال سے جیت دکھی ہو گیا، 'ہاں۔...تم جو یہاں نہیں ہو۔'

'تو نہ جاتا مجھ سے اتنی دور۔'

'ماں!...میں اکیلا تو گھر سے دور نہیں رہ رہا ہوں۔...مجھ جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے۔' جیت ماں کو سمجھاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

'ہوں، اچھا ایسا کر...اپنے مکان مالک سے بات کر لے گھر کے کھانے کے لیے۔...کچھ پیسے الگ سے دے دینا۔'

'نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے۔'

'باہر سے کھا کھا کر بیمار پڑ جائے گا۔...ضد نہ کر، ورنہ...'

'اچھا، ٹھیک ہے۔...تم چنتا نہ کرو۔...اب فون پاپا کو تو دو۔'

پاپا سے باتیں کرتے ہوئے جیت دوبارہ بالکنی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے دیکھا تو کھڑکی سے کچھ دور رکھی کھانے کی میز پر آنٹی کھانوں کے ساتھ ساتھ موم بتیوں سے سجا ایک کیک رکھ رہی تھیں۔

آنٹی بائیں کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انکل بھی ان کے ساتھ میز کے نزدیک آئے۔ وہ کچھ جھنجلائے سے لگتے تھے۔ آنٹی نے گھڑی دیکھی، کھڑکی سے باہر جھانکا، پھر موبائل پر کسی کو کال کرنے لگیں۔ شاید کال ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ موبائل میز پر رکھ کر دائیں طرف بنے کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ گھر کے باہر تھیں۔

آنٹی اطراف میں دیکھتیں، پھر گھڑی دیکھنے لگتیں۔ وہ کچھ بے چین سی تھیں۔ شاید انھیں کسی کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد انکل بھی باہر آگئے اور آنٹی کو اندر لے جانے لگے لیکن وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔ وہ کسی طور پر اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ جیت نے جلدی سے بات ختم کی۔ اسے لگا، کوئی بات ہوگئی ہے۔

'سمجھتی کیوں نہیں ہو؟...جا چکا وہ ہمیں چھوڑ کر، اپنی خواہش پوری کر لی اس نے۔' انکل جھنجلا کر چیخ پڑے اور آنٹی ایک دم ساکت ہوگئیں۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سبھی اپنے اپنے گھروں میں تھے لیکن سناٹے میں گونجتی ہوئی آواز سن کر کچھ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ کچھ جیت کی طرح بالکنی میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کچھ عورتیں کھڑکیوں سے جھانکنے لگیں۔

'کیا بات ہے، مشرا جی؟...کوئی سمسیا ہے کیا؟' ڈاکٹر راجیش نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

'آج وجے کی سالگرہ ہے۔'

'اوہ!' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

'بہت دکھ ہوتا ہے، بھابھی کی حالت دیکھ کر۔' عامر علی نے کہا۔

'انھیں اندر لے جائیے۔...اوپر والا آپ کو صبر دے۔' ایک شخص کے کہنے پر انکل سست روی سے چلتے ہوئے گم صم کھڑی آنٹی کو اندر لے گئے۔ اس بار انھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

باقی سب بھی افسردہ سے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

'کیسا بیٹا ہے یہ وجے بھی۔...اس عمر میں ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی خواہش پوری کرنے چلا گیا۔' جیت کو بڑا غصہ آیا۔ اسے ایسے نوجوانوں سے سخت چڑ تھی جو والدین کو چھوڑ کر اپنی خواہشیں پوری کرنے دیارِ غیر میں جا بستے ہیں یا پھر بیوی کے کہنے پر بوڑھے ماں باپ کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے خود پر فخر ہوا کہ وہ ایک اچھا بیٹا ہے۔ گھر والوں کے آرام کے لیے ان سے دور ہے تو کیا ہوا، ان سے محبت بھی تو کرتا ہے۔ اسے اپنی ماں کی کتنی یاد آتی ہے لیکن یہ وجے کتنا بدنصیب ہے جس نے ماں کو ایک لا حاصل انتظار کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے وہ سونے چلا گیا۔ آخر کار اسے ان بزرگوں کی اداسی کی وجہ معلوم ہوگئی تھی۔ اسے رہ رہ کر وجے پر غصہ آ رہا تھا۔

جیت پس و پیش میں مبتلا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بالکنی میں چلا آیا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ سامنے دیکھا تو انکل کھانے کی میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں اخبار تھاما ہوا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر راجیش بھاگتے ہوئے آئے اور انکل کے دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو گئے۔ ان دونوں کے پریشان چہروں کو دیکھ کر جیت کو کسی انہونی کا احساس ہوا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ ساری جھجک بالائے طاق رکھ کر وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کچھ دور چل کر سامنے والے گھر میں داخل ہو گیا۔ جلد بازی میں انکل نے دروازہ بند نہیں کیا تھا

ان دنوں آفس میں کام زیادہ تھا، اس لیے جیت بہت مصروف تھا۔ اپنی مصروفیت میں گھر کر گھر والوں سے بات بھی نہیں کر پایا تھا لیکن سامنے والے گھر پر کبھی کبھی نظر ڈال لیتا تھا۔ آج کل آنٹی نظر نہیں آتی تھیں۔ ایک آدھ بار انکل کچن میں کھڑے دکھائی دیے تھے۔ آفس آتے جاتے بھی آنٹی یا انکل پر نظر نہیں پڑی تھی، ورنہ شام کے وقت محلے کے کچھ بزرگوں کے ساتھ انکل نکڑ والی چائے کی دکان پر بیٹھے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ جیت نے سوچا کہ ایک بار چل کر ان کی خیریت پوچھ لیں۔ کیا پتہ، آنٹی بیمار ہوں۔ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔ بیٹا تو ان کا خودغرض نکل گیا۔ نہ جانے کیوں وہ بوڑھے والدین کو چھوڑ کر چلا گیا۔ جیت نے ان کے گھر محلے کے چند لوگوں کے علاوہ کسی رشتہ دار وغیرہ کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا، 'پتہ نہیں، ان کے گھر کا خرچہ کیسے چلتا ہوگا؟'

فرصت کے لمحوں میں جیت اکثر ایسی باتیں سوچ کر کڑھا کرتا تھا لیکن ان دنوں مصروفیت اتنی تھی کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ ان کے گھر نہ جا سکا۔

'سنا ہے، مشرا جی کی پتنی بہت بیمار ہیں۔' گھر آتے ہوئے جیت نے چائے کی دکان پر بیٹھے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا تو ٹھٹک سا گیا۔

'ہاں، مشرا جی کی بھی عجیب قسمت ہے۔۔۔ پہلے اکلوتے بیٹے کی دوری برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اب بیوی نیم پاگل ہو گئی۔' عامر علی نے کہا۔

'اوپر والا ان کو سکتی دے۔۔۔ بڑا دل دکھتا ہے انھیں دیکھ کر۔' چائے والے کی بات پر سب نے اتفاق کیا۔

دکھ جیت کو بھی ہوا مگر اسے غصہ بھی خود پر آیا کہ پڑوسی ہونے کے باوجود اتنا بے خبر رہا، 'کل ضرور جاؤں گا۔' اس نے دل میں پکا ارادہ کیا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

'شکر ہے، کل سنڈے ہے۔' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے وہ بڑبڑایا۔ تھکن سے برا حال تھا، اس لیے بنا کچھ کھائے پیے ہی سو گیا۔

اگلی صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی پر نظر پڑتے ہی چونک پڑا، 'اوہ!۔۔۔ دس بج گئے۔' وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا تو اسے یاد آیا، آنٹی کو دیکھنے بھی جانا ہے۔

جیت نے جلدی جلدی روزمرہ کے کام نمٹائے۔ اتنے میں مکان مالک کا چھوٹا بیٹا ناشتہ لے کر آ گیا۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھول کر ٹرے لی اور بڑے بڑے لقمے لے کر ناشتہ ختم کر دیا۔ ابھی اسے ڈھیروں کام نمٹانے تھے لیکن وہ چاہتا تھا کہ پہلے آنٹی کو دیکھ آئے، ورنہ کام میں پھنس کر بھول جائے گا۔

انکل کے ہاں جانے کے خیال سے ہی جیت کو جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے جائے۔

'پتہ نہیں، وہ لوگ کیا سوچیں گے میرے بارے میں کہ صبح صبح منہ اٹھا کر چلا آیا۔'

جیت پس و پیش میں مبتلا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بالکنی میں چلا آیا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ سامنے دیکھا تو انکل کھانے کی میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں اخبار تھاما ہوا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر راجیش بھاگتے ہوئے آئے اور انکل کے دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو گئے۔ ان دونوں کے پریشان

چہروں کو دیکھ کر جیت کو کسی انہونی کا احساس ہوا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ ساری جھجک بالائے طاق رکھ کر وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کچھ دور چل کر سامنے والے گھر میں داخل ہوگیا۔ جلد بازی میں انکل نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

'چنتا کی کوئی بات نہیں ہے....میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ اب بھابھی جی بالکل ٹھیک ہیں۔' ڈاکٹر راجیش انکل کو تسلیاں دیتے ہوئے مڑ گئے۔ دونوں جیت کو سامنے دیکھ کر چونک سے گئے۔

'و، وہ، میں سامنے والے گھر سے آیا ہوں....کرایہ دار ہوں۔' جیت ٹھیک سے بول نہیں پا رہا تھا۔

'جانتا ہوں....آتے جاتے کئی بار تمھیں دیکھا ہے....بیٹھو!...ڈاکٹر راجیش کو باہر تک چھوڑ کر آتا ہوں۔'

'جی۔' جیت وہاں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

انکل ڈاکٹر راجیش کو چھوڑنے چلے گئے۔

'معاف کرنا، بیٹا!...تمھیں صرف چائے پلا پاؤں گا....اصل میں میری پتنی بیمار ہے، اس لیے تمھاری خاطر نہیں کر سکتا۔' جیت جو گھر کے جائزے میں مگن تھا، انکل کی آمد پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

'ارے نہیں، چائے مت بنائیے....میں آنٹی کو ہی دیکھنے آیا ہوں۔' جیت نے وضاحت کی۔ اب اس کی جھجک قدرے کم ہو چکی تھی۔ کافی عرصے سے وہ انھیں دیکھ رہا تھا، اس لیے اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

'اسے ایسے دورے پڑتے رہتے ہیں....اب ہم عادی ہو چکے ہیں۔' انکل نے ٹھنڈی سانس لی۔

'ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'

'اصل میں سادھنا کو وجے کا انتظار ہے۔ وجے...میرا بیٹا۔'

'تو آپ اسے بلا کیوں نہیں لیتے؟...مجھے لگتا ہے، آنٹی کی حالت جان کر وہ آ جائے گا۔' جیت کے کہنے پر وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔

'وہ نہیں آئے گا۔' انکل کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔

'ایسی بھی کیا خواہش ہے، جس کے پیچھے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ گیا۔' کب سے ذہن میں بیٹھی ہوئی بات جیت کے لبوں پر آ گئی مگر یہ سوچ کر وہ شرمندہ سا ہو گیا کہ پہلی ہی ملاقات میں اسے اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

'وجے کو اپنے دیش کے لیے شہید ہونے کی خواہش تھی۔' انکل نے آہستگی سے کہا۔

جیت سکتے میں رہ گیا، 'اس کا مطلب...' کچھ دیر تک وہ بولنے کے قابل نہ رہا۔

'ہاں!...میرا بیٹا ایک بہادر فوجی تھا اور مجھے گرو ہے کہ میں اس کا پتا ہوں۔' ان کی آواز بھرا گئی لیکن فخر سے سینہ تن گیا۔

جیت کو لگا، وہ شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ وہ کل تک خود کو ایک اچھا بیٹا سمجھتا تھا جو اپنی ماں کے آرام کی خاطر مشکلیں جھیل رہا تھا لیکن وجے تو اپنے وطن کے لیے شہید ہو گیا، جو محفوظ ہے تو اس کی ماں بھی محفوظ ہے۔

'م، م، مجھے معاف کر دیجیے، انکل!...مجھے لگا...' جیت سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اکثر ٹی وی پر خبریں آتی تھیں کہ ہمارے جوان بے دردی سے شہید کر دیے گئے لیکن اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کی شہادت کے بعد ان کے گھر والوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ آج جیت نے دیکھا تو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ واقعی فوجیوں کے گھر والوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔

'کوئی بات نہیں....مجھے وجے کے جانے کا افسوس نہیں ہے....اگر میرے دس بیٹے بھی ہوتے تو میں انھیں اپنے دیش پر قربان کر دیتا۔'

جیت نے ضبط سے سرخ پڑتی آنکھوں سے اس عظیم شخص کو دیکھا جو وجے جیسے بہادر فوجی کا باپ تھا۔

'اب آنٹی کی طبیعت کیسی ہے؟' جیت نے بہ مشکل پوچھا۔

'ٹھیک ہے....نیند کے انجکشن کی وجہ سے سوئی ہوئی ہیں۔'

'ان کی یہ حالت کب سے ہے؟'

'پانچ سالوں سے....جب سے اس نے وجے کی لاش کو ترنگے میں لپٹے ہوئے دیکھا۔' ہزار ضبط کے باوجود وہ سسک پڑے۔ جیت انھیں تسلی دینے کے لیے اٹھا، ان کے کندھے پر اس نے ہاتھ رکھا مگر اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکا۔ اسے لگا جیسے وجے اس کا سگا بھائی تھا جس کی موت پر اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

'نہ جانے کب آنٹی کا انتظار ختم ہوگا؟' جیت کے ذہن میں یہ بات آئی تو وہ بھبک کر رونے لگا اور بہت دیر تک روتا رہا۔

□□□

Ada Fatima

C/o. Syed Shabbir Haider(Advocate),

Jahazi Kothi,Mohalla Kamra

Muzaffarpur-842001 (Bihar)

ہم تیری منزل نہ تھے

روبینہ ساگر روبی

دسمبر کی سرد و حسین شام دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی، سورج میں ہلکی زردی ابھی باقی تھی، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے روح میں اتر رہے تھے، زمین پر بیٹھے پرندے پروں کو پھڑ پھڑا رہے تھے تو کچھ پرندے تیزی سے اپنی خواب گاہوں کی طرف محو پرواز تھے۔ فضا میں کوئل کی سریلی میٹھی آواز گونج رہی تھی۔

'الیشبہ آپی مما کی کال دو بار آ چکی ہے شام ہو گئی ہے پلیز جلدی کیجیے۔'

آبان بیزاری سے بولتا ہوا عجلت بھرے انداز میں آگے بڑھا تھا۔ شاپنگ مال میں بے حد رش تھا، وہ اپنے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز اٹھائے تیزی سے آبان کے پیچھے چل رہی تھی، تبھی وہ کسی سے بری طرح ٹکرائی تھی۔

'آئی ایم سوری مس' احیان خان کی سرد و سپاٹ آواز پر اس نے اپنی نظروں کو اٹھا کر دیکھا تھا، براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والا وہ ہینڈسم پراؤڈی شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

'اٹس او کے مسٹر' وہ مدھم لہجے میں بولی۔

'مسٹر نہیں مجھے احیان خان کہتے ہیں۔' وہ اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ براؤن آنکھوں میں کاجل لگائے سیاہ ڈریس میں ملبوس اپنے لمبے سیاہ بالوں کو پشت پر پھیلائے وہ بدلیوں میں چھپا چاند نظر آ رہی تھی، احیان خان کی نظریں اس کے اوپری ہونٹ کے دائیں طرف نظر آتے تل میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

'الیشبہ آپی' آبان کے آواز دینے پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور ایک نظر گم صم کھڑے احیان خان پر ڈال کر چلی گئی تھی۔

وہ اسے اکثر اچانک کہیں بھی نظر آ جاتی تھی آج اس نے اسے پورے تین ماہ بعد دیکھا تھا اور آج بھی اس سے اپنا حال دل نہیں کہہ پایا تھا کیونکہ وہ لڑکا ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا جو یقیناً اس کا بھائی تھا، وہ اسے فرسٹ ٹائم ایک فلاور شاپ پہ نظر آئی تھی اور وہ اسے پہلی بار دیکھ کر ہی اس پریوں کی ملکہ کا دیوانہ ہو گیا تھا، اسے اپنا دل دے بیٹھا تھا، وہ بھی اسے رک کر کچھ پل دیکھتی ضرور تھی مگر وہ دونوں بھی اجنبی تھے اس نے اس کی لائف ڈسٹرب کر کے رکھ دی تھی وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اس نے احیان خان کا دل چھینا تھا وہ احیان خان جس کے سنگ زندگی گزارنے کا خواب جانے کتنی لڑکیاں دیکھتی تھیں، اس نے زندگی میں جس چیز کو بھی چاہا تھا، جس چیز کی بھی خواہش کی تھی وہ چیز اس کی ہو گئی تھی، وہ شہر کے جانے مانے بزنس مین حبیب خان کا بیٹا تھا۔

'ہوش میں آ جاؤ شہزادے، یار وہ پریوں کی ملکہ جا چکی ہے۔' اشہب نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا اور وہ سست قدموں سے چلتا ہوا اشہب کے سنگ باہر نکل آیا تھا اور گاڑی میں بیٹھی الیشبہ اسے نظر آ گئی تھی۔

'اشہب اس کی گاڑی کا پیچھا کرو آج مجھے پتا کرنا ہی ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے۔' بے تابی سے بولتا ہوا وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

وہ اپنے پیچھے آتی احیان خان کی گاڑی کو دیکھ چکی تھی، وہ جان گئی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے آیا ہے۔ وہ گاڑی سے نکل کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی آبان کے پیچھے اندر چلی آئی تھی۔

'الیشبہ یہ والا ڈریس کتنا خوبصورت لگ رہا ہے نا، ایسا کرو تم یہ ڈریس بھی مجھے دے دو۔' علیشہ اس کے ڈریس کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولی۔

'نہیں کبھی نہیں علیشہ کی بچی تمہیں پتہ تو ہے کہ میں اپنی چیز کسی کو نہیں دیتی شیئر کرنا مجھے پسند ہی نہیں۔' شرارت سے بولتے ہوئے اس نے

اپنے پاپا ڈاکٹر اذہان علی کی طرف دیکھا تھا جو ان دونوں کی نوک جھونک پر مسکرا رہے تھے۔

'مما پلیز مجھے ایک کپ چائے بنا دو ان دونوں کی بک بک سے میرا سر درد کرنے لگا ہے'۔

آبان نے وہیں بیٹھے بیٹھے مما کو پکارا تھا جو کچن میں کھڑی کھانا بنا رہی تھیں۔

'میں نے کتنی بار کہا ہے کہ آپ دونوں ایک جیسی چیزیں لیا کرو آخر آپ دونوں ٹونز سسٹرز ہو تو چیزیں بھی ایک جیسی ہونی چاہیے نا' آبان شرارت سے بولا تھا وہ ان دونوں سے چھوٹا تھا اور انجینئرنگ کی پڑھائی کر رہا تھا، علیشہ کو پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس نے بی ایس سی کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور الیشبہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، وہ ہاسٹل میں رہتی تھی اور چھٹیوں میں اکثر گھر آتی تھی وہ کم گو اور سنجیدہ سی تھی، جبکہ علیشہ اس کے برعکس چلبلی و شرارتی لڑکی تھی، دونوں جڑواں تھی لیکن ان کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے کافی جدا تھے۔ ان دونوں کو ایک نظر میں دیکھنے والے اکثر کنفیوز ہو جاتے تھے علیشہ نے اپنے کالے بالوں کو براؤن کر لیا تھا اور الیشبہ کے بال سیاہ تھے اس کے اوپری ہونٹ کے دائیں طرف تل تھا جبکہ علیشہ کے چہرے پر کوئی تل نہیں تھا۔

رات گہری ہو گئی تھی، کالی گھٹائیں آسمان پر چھائی ہوئی تھی، کل صبح اسے ہاسٹل واپس جانا تھا لیکن آج پھر نیند اس سے روٹھ گئی تھی، وہ سونے کی کوشش میں بار بار اپنی آنکھیں بند کرتی مگر احیان خان کا چہرہ اس کی محبت اسے سونے ہی نہیں دے رہی تھی، وہ اجنبی شخص اس پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ اس کے آگے اسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا، سانسیں تو اس کی اپنی تھی لیکن دھڑکنوں پر احیان خان اپنا نام لکھ گیا تھا جس پر صرف اسی کا قبضہ ہو گیا تھا، کچھ لوگ زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جن سے تھوڑی دیر ملنے کے بعد وہ ہماری زندگی بن جاتے ہیں، احیان خان بھی اس کی زندگی بن گیا تھا اس کے بغیر اس دنیا کی ہر شئے ویران و اداس لگ رہی تھی۔

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تازہ دم کھلے پھول سرما کی رم جھم برستی بارش میں بھیگے ہوئے تھے، پرندے اپنے آشیانوں سے نکل کر زمین پر اتر آئے تھے اور بھیگے پروں سمیت دانہ چگنے میں مصروف ہو گئے تھے، آج موسم کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔

'ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے ہماری طرف سے یہ رشتہ پکا سمجھو' احیان خان کی مما نے محبت سے کہتے ہوئے علیشہ کے ہاتھ میں اس کے نام کی انگوٹھی پہنا دی تھی۔

'ہم لوگ بہت جلد علیشہ کو رخصت کروا کر اپنے گھر لے جائیں گے۔' بولتے ہوئے انھوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ مما پاپا اور آیان مسکرا دیے تھے۔

'علیشہ بھابھی میں آپ کی جڑواں بہن سے کب مل سکتی ہوں مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے'۔ احیان خان کی چھوٹی بہن عفرا مسکراتے ہوئے بولی۔

'الیشبہ کے ایگزامز ہونے والے ہیں، وہ پڑھائی میں بہت بزی ہو گئی ہے، اس سے آپ کی ملاقات تو اب میری شادی پر ہی ہو گی'۔

مما پاپا اور آیان علیشہ کی شادی کی تیاریوں میں بزی تھے اور الیشبہ امریکہ جانے کی تیاری میں مصروف تھی، وہ میڈیکل کی آگے کی پڑھائی کے لیے امریکہ جا رہی تھی، علیشہ کی شادی سے ایک دن پہلے ہی اس کی فلائٹ تھی۔

'الیشبہ پھوپھو نے ہم سب کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے، مما کہہ رہی ہے تم بھی تیار ہو جاؤ'۔ وہ جو شیلف میں کتابیں رکھ رہی تھی، علیشہ کی آواز پر مڑ کر دیکھا تھا۔

'نہیں یار مجھے ابھی بہت سارے کام کرنے باقی ہیں، تم لوگ جاؤ میں پھر کبھی پھوپھو سے مل کر آ جاؤں گی'۔ وہ علیشہ کے گال کو پیار سے چھوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

'بہت پیاری لگ رہی ہو، علیشہ احیان بھائی جس دن تمھیں دیکھیں گے اس دن اپنے ہوش کھو دیں گے، کیونکہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو ابھی تک دیکھا جو نہیں، کتنی عجیب بات ہے یار میں بھی ان سے ابھی تک نہیں مل پائی ہوں، حالانکہ میں ان کی اکلوتی سالی ہوں میں پڑھائی میں اتنی بزی ہو گئی تھی کہ مجھے ان سے ملنے کا ٹائم ہی نہیں ملا'۔ افسوس سے بولتے ہوئے وہ کہیں کھو گئی تھی۔

'یا خدا یہ بھی کتنا عجیب اتفاق ہے کہ علیشہ کی شادی جس سے ہو رہی ہے اس کا نام احیان خان ہے اور اس اجنبی شخص کا نام بھی یہی تھا'۔

'الیشبہ اب تو تم میری شادی میں بھی نہیں رہو گی، میری شادی سے زیادہ تمھارا امریکہ جانا ضروری ہے نا'۔ خفگی سے بولتی ہوئے علیشہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

'نہیں ڈیئر مجھے تمھاری خوشی سے زیادہ کوئی خوشی نہیں، لیکن میرا امریکہ جانا بہت ضروری ہے، دیکھنا جب ایک دن میں قابل اور کامیاب ڈاکٹر بن کر اپنے ملک اپنی سرزمین پر لوٹوں گی تو تم خود فخر سے کہو گی کہ دیکھو یہ میری ہم شکل جڑواں بہن ڈاکٹر الیشبہ اذہان' بولتے ہوئے اس نے

علیشہ کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگی زار و قطار رو رہی تھیں کیونکہ ان دونوں کو اب ایک دوسرے سے بچھڑ جانا تھا۔'علیشہ الیشبہ جلدی کرو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔' مما کی پکار پر علیشہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی تھی اور وہ احیان خان کی یادوں میں گم ہو گئی تھی۔ تبھی ملازمہ نے آ کر اسے احیان خان کے آنے کی اطلاع دی تھی، وہ اٹھ کر روم میں چلی آئی تھی اور وہاں موجود شخص کو دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی، وہ اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا، بلیک جینز پر بلیک شرٹ پہنے اور آنکھوں پر بلیک ہی گلاسز لگائے وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا، الیشبہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔

''احیان خان آپ یہاں کیسے' وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

'کیوں کیا مجھے اپنی ہونے والی وائف سے ملنے کی پرمیشن لینی چاہیے تھی، کیا مس علیشہ یار میں آپ کا ہزبینڈ بننے والا ہوں میں نے یوں اچانک آ کر آپ کو سرپرائز دیا نا۔' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا شوخی سے بولا۔ اس کی باتوں پر الیشبہ کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا تھا، پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی یا پھر سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

'منگنی کے بعد تو آج ہم ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، مما آپ کو میرے نام کی انگوٹھی پہنا گئی تھی۔ کیونکہ میں بزنس کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔' الیشبہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے ایک طوفان تھا جو اس کے اندر مچا ہوا تھا، ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ چکی تھی، وہ اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ چکا تھا اور اس کے قریب آتا ہوا بے تابی سے بولا تھا۔

'آر یو او کے علیشہ کیا ہوا آپ اتنی گھبرا کیوں رہی ہو۔'

'احیان خان میں علیشہ نہیں بلکہ ڈاکٹر الیشبہ اذہان ہوں علیشہ کی ہم شکل جڑواں بہن اور آپ کی منگنی مجھ سے نہیں علیشہ کے ساتھ ہوئی ہے۔' تلخی سے بولتے ہوئے اس نے اس کے سر پر دھماکہ کیا تھا، اسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے اندر تیز نوکیلا خنجر اتار دیا ہو، اس کی روح زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی جیتے جی مر جانا کسے کہتے ہیں آج اس نے جانا تھا وہ وحشت بھری نظریں اس پر گاڑتے ہوئے بولا تھا۔

'نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا الیشبہ کبھی نہیں ہو سکتا میں یہ درد سہہ ہی نہیں سکتا آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا سنا آپ نے۔' وہ تیز آواز میں چیخا تھا۔

'ایسا ہو چکا ہے آپ اس حقیقت کو فیس کر لیجیے۔' کانپتی آواز میں بولتے ہوئے اس نے اپنی جلتی آنکھوں کو پونچھا تھا۔

'آر یو او کے' علیشہ کیا ہوا آپ اتنی گھبرا کیوں رہی ہو۔'

''احیان خان میں علیشہ نہیں بلکہ ڈاکٹر الیشبہ اذہان ہوں علیشہ کی ہم شکل جڑواں بہن اور آپ کی منگنی مجھ سے نہیں علیشہ کے ساتھ ہوئی ہے۔' تلخی سے بولتے ہوئے اس نے اس کے سر پر دھماکہ کیا تھا، اسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے اندر تیز نوکیلا خنجر اتار دیا ہو، اس کی روح زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی جیتے جی مر جانا کسے کہتے ہیں آج اس نے جانا تھا وہ وحشت بھری نظریں اس پر گاڑتے ہوئے بولا تھا''

'احیان خان صرف آپ کو چاہتا ہے الیشبہ آپ کو دیکھ کر جیتا ہے اور مجھے صرف آپ سے ہی شادی کرنی ہے بس دلہن بدلے گی اور کچھ نہیں...... نہیں احیان خان آپ ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے۔' وہ اس کی بات کو تیزی سے کاٹتے ہوئے بولی۔

شادی کے کارڈز بٹ چکے ہیں، اس بات کا ذکر زندگی میں پھر کبھی نہ کرنا یہ بات یہیں ختم ہو جانا چاہیے، میں اپنا کوئی تماشہ نہیں بنانا چاہتی، وہ محبت ہی کیا جو سر بازار عام ہو جائے۔'

'لیکن میں تو آپ کو چاہتا ہوں الیشبہ اور چاہت کبھی ختم نہیں ہوتی تو پھر میں کیسے علیشہ سے شادی کر لوں میں نے تو مما کو آپ کے لیے بھیجا تھا لیکن پتہ نہیں کیسے...... وہ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے بھیگے لہجے میں بولا۔

'کیا آپ خوش رہ پاؤ گی میرے بغیر نہیں نا۔'

'مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں نا آپ تو سب کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے، میری محبت کی خاطر سب کچھ ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ اور علیشہ سے شادی کر لو اور ویسے بھی میں کچھ دنوں میں امریکہ جانے والی

ہوں۔' اس نے ایک اور دکھ اس کی جھولی میں ڈالا تھا اشک تیزی سے اس کے گالوں پر پھیل رہے تھے۔

'کسی کو چاہ کر کھو دینا بہت تکلیف دیتا ہے الیشبہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں اگر وہ نہ بھی ملے تو بھی ہم اس کے ہی رہتے ہیں کیونکہ محبت ہی جینے کی وجہ ہوتی ہے، بہت خوش تھا میں کہ آپ کچھ دنوں میں میری زندگی میں شامل ہو جاؤ گی لیکن آج ہر امید نے دم توڑ دیا ہزار سپنے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے میں نے آپ کو کھو دیا دل اس حقیقت کو قبول ہی نہیں کر رہا۔' وہ ٹوٹے لہجے میں بولا تو الیشبہ سسک اٹھی تھی۔

'یہ سچ ہے احیان خان کے میرے دل نے بھی آپ کو چاہا ہے، آپ میری مانگی ہر دعا میں شامل تھے، لیکن میری ہر دعا میری بہن کے حق میں قبول ہو گئی ہے، آپ بن مانگے ہی اس کا نصیب بن گئے، مجھے آپ سے اپنی بہن سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ یہی میری قسمت تھی اور تقدیر کے فیصلے خدا ہی لکھتا ہے۔' بولتے بولتے وہ بے تحاشا رو رہی تھی، اور وہ بے بس سا کھڑا بس اسے ہی دیکھے جا رہا تھا، اس کی جان زندگی اس کے قریب کھڑی تھی لیکن اس کا نصیب نہیں تھی۔

'بس کرو الیشبہ اب ایک آنسو بھی مت بہانا پلیز میری خاطر حالانکہ میں جانتا ہوں کہ یہ آنسو اب آپ کے ہم سفر بن گئے ہیں، میری زندگی کی ہر خوشی ہر دعا اب آپ کے نام کرتا ہوں اور ہاں یہ میری آخری التجا ہے مجھے اپنے دل سے کبھی مت نکالنا ہمیشہ آباد رکھنا اللہ حافظ۔' کہتے ہوئے اس نے بے دردی سے اپنی لہولہو ہوتی آنکھیں صاف کی تھیں اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ لیکن جاتے جاتے اپنی خوشبو اس کے وجود میں بھر گیا تھا اور وہ نڈھال سی صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کا آبلہ بنا دل آج پھوٹ گیا تھا۔ ساری رات وہ اذیت کی بھٹی میں جلتی رہی تھی۔

رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی، ستارے رخصت ہو رہے تھے، سورج کی اجلی کرنیں پھیل رہی تھیں، آنکھیں بند کر کے سوئی کلیاں پھول بن کر خوشبو بکھیر رہی تھی، رات پھر اس کے دل پر قیامت گزری تھی اور آج پھر اداس کر دینے والی صبح اس کی منتظر تھی۔

وہ نماز فجر ادا کر کے کھڑکی کے پاس کھڑی تھی، اور اس کی نظریں بیڈ پر بے خبر سوئی علیشہ پر تھی اس کے دونوں ہاتھ تکیوں پر تھے، جن پر مہندی سے بنے گل بوٹے بہت حسین لگ رہے تھے، الیشبہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کے سرخ ہاتھوں کو دیکھا تھا، اس کے ہاتھوں پر سجنے والی مہندی آج اس کی بہن کی ہتھیلیوں پر رنگ لائی تھی، اور اس کے ہاتھ بے رنگ رہ گئے تھے، وہ جو اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی کو نہیں دیتی تھی، آج اپنی زندگی اس کے حوالے کر دی تھی اپنی زندگی کے سارے اجالے اپنی بہن کے نام کر دیے تھے۔

'سدا خوش رہو علیشہ سدا خوش رہو احیان خان کے سنگ تمہارا رشتہ ہمیشہ برقرار رہے۔' اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا تھا اور تیار ہونے چل دی تھی آج اس کی امریکہ کی فلائٹ تھی۔

زندگی بہت تیزی سے اپنے سفر پر گامزن تھی، دن ڈھل کر شام اور شامیں راتوں میں کھوتی گئیں، موسم بدلتے گئے، تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن یادیں رک جاتی ہیں جن میں کھو کر ہر نقش ابھر آتے ہیں، احیان خان کے دل میں بھی ڈاکٹر الیشبہ اذہان کی ہر یاد، ہر ملاقات، ہر بات روشن تھی، اسے امریکہ گئے ہوئے تین سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی احیان خان کی ہر یاد ہر دعا ہر احساس اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا تھا، اس کا دل آج بھی الیشبہ کے نام پر دھڑکتا تھا، علیشہ اس کی زندگی کی ساتھی تو بن گئی تھی لیکن دل کی ساتھی نہ بن سکی تھی، وہ زندگی جینا بھول گیا تھا۔ وہ زندگی کو نہیں بلکہ زندگی اسے گزار رہی تھی اس کا دل محبت میں ٹوٹا نہیں تھا مر گیا تھا اور مردہ دل کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا سوائے محبوب کی محبت کے، راتوں کے اندھیروں میں اسے اکثر یہ گمان ہوتا تھا جیسے ڈاکٹر الیشبہ اذہان اسے پکار رہی ہو اور وہ گہری نیند سے اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا، بارش تیز ہو گئی تھی، آسمان صبح سے مسلسل رو رہا تھا جانے وہ کس کی یاد میں تڑپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، آنسوؤں کی بارش اور باہر برستی بارش بھی اس کے دل میں لگی آگ کو بجھا نہیں پا رہی تھی۔ آج پھر ڈاکٹر الیشبہ اذہان کے دل میں احیان خان کی یادوں کی کرنیں نمودار ہو گئی تھی، وہ اس سے ہزاروں میل دور بیٹھی، اجنبی ملک اجنبی سرزمین اور اجنبی لوگوں کے درمیان بھی تنہا نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کے دل کے قبرستان میں دفن احیان خان کی محبت ہر روز انگڑائی لیتی تھی، محبت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا بنا رکے بنا تھکے چلتا ہی رہتا ہے، محبت میں ملی جدائیاں کبھی ختم نہیں ہوتی عمر بھر تڑپاتی ہیں اور انسان اس جدائی کی آگ میں عمر بھر تڑپتا ہی رہتا ہے۔

□□□

Rubina Sagar Rubi
D/o. Shaikh Bilal Sagar
Hirapura, Near Masjid Darus Salam
A.F. Company, Achalpur City
Dist. Amravati-444806 (M.S)

ممتاز مرزا

غزل

غموں میں ڈوبی ہوئی ہے ہر اک خوشی میری
عجیب طور سے گزری ہے زندگی میری

ہر ایک لمحہ گزرتا ہے حادثے کی طرح
بس ایک دردِ مسلسل ہے زندگی میری

خیال و فکر نے کیا کیا صنم تراشے تھے
تمام عمر پرستش میں کٹ گئی میری

مرا سفینۂ ہستی ہے اور موجِ بلا
تماشا دیکھتی رہتی ہے بے بسی میری

ہجوم درد میں گم ہو گئی مری آواز
زمانے والوں نے روداد کب سنی میری

مری حیات ادھوری رہی تمھارے بغیر
بتاؤ تم نے بھی محسوس کی کمی میری

غمِ حیات کی روداد تھی مگر ممتاز
سمجھ لیا اسے لوگوں نے شاعری میری

کشور ناہید

غزل

اے رہ ہجر نو فروز دیکھ کہ ہم ٹھہر گئے
یہ بھی نہیں کہ زندہ ہیں یہ بھی نہیں کہ مر گئے

خواب تلک رہائی تھی تیرے فراق و ہجر سے
آنکھ کھلی تو آئینے تہہ میں کہیں اتر گئے

تو بھی مری طرح رہا دھیان اٹھائے شہر کا
سوئے تو چھاؤں سو گئی قافلے کوچ کر گئے

تجھ کو بہت قریب سے دیکھ کے یوں لگا کہ اب
خیمۂ جاں اکھڑ گیا دشت طلب گزر گئے

دل کی گواہی کے لیے رسم دعا بری نہ تھی
رنج خمار بے ثمر ڈھونڈنے اس کے گھر گئے

ہم ہی تھے وہ بلاکشاں دار و رسن تھے جن کی جاں
ہم ہی تھے شب کے ہم سفر ہم ہی نہ اپنے گھر گئے

دل کو ترے فراق کی آرزو یاد رہ گئی
دن وہ محبتوں کے بھی مثل رہ سفر گئے

میرے لیے بھی خواب تھے اس نے رکھے ہوئے کہیں
شہر میں ان کو ڈھونڈنے قاصد بے ہنر گئے

نوشی گیلانی

غزل

ہر جانب ویرانی بھی ہو سکتی ہے
صبح کی رنگت دھانی بھی ہو سکتی ہے

جب کشتی ڈالی تھی کس نے سوچا تھا
دریا میں طغیانی بھی ہو سکتی ہے

نئے سفر کے نئے عذاب اور نئے گلاب
صورت حال پرانی بھی ہو سکتی ہے

ہر پل جو دل کو دہلائے رکھتی ہے
کچھ بھی نہیں حیرانی بھی ہو سکتی ہے

سفر ارادہ کر تو لیا پر رستوں میں
رات کوئی طوفانی بھی ہو سکتی ہے

اس کو میرے نام سے نسبت ہے لیکن
بات یہ آنی جانی بھی ہو سکتی ہے

شہناز فاطمہ صدیقی

غزل

اس نظر سے جو رابطہ ہو جائے
کچھ نہ ہونا بھی حادثہ ہو جائے

وہ کریں التجا، میں ترک کروں
مجھ کو اک ایسا تجربہ ہو جائے

یوں نہ ہو پھر ہو تیرا قرب نصیب
یوں نہ ہو پھر یہ سانحہ ہو جائے

نام لیتے ہی دل دھڑکتا ہے
سامنے آئے وہ تو کیا ہو جائے

کام کتنا ہے اس کی یادوں کا
آج پھر سے نہ رتجگا ہو جائے

جب اذیت ہیں قربتیں شہناز
پھر تو بہتر ہے فاصلہ ہو جائے

Shahnaz Fatima Siddiqui
H.No.293/767
Old Haider Ganj
Lakarmandi
Lucknow-226003 (U.P)

ڈاکٹر رونق جہاں زیدی

نظمیں

وہ بڑھتے جا رہے تھے
ان کی مٹھیوں میں بند تھا
.........طوفان
اور آنکھوں میں دہک رہے تھے
......................انگارے
ان کی آوازوں میں گرج رہا تھا
.........سمندر
خواہشوں اور آرزوؤں کا
سیلاب ان کے قدموں میں تھا
دوار دوار پر دستک دیتے
بڑھ رہے تھے
مٹھیوں میں بند طوفان
........اب آزاد تھا
انگارے دھرتی پر دہک رہے تھے
سمندر انھوں نے کھلا چھوڑ دیا تھا
اور سیلاب گلیوں، کھیتوں
سڑکوں پر پھیل رہا تھا
دیکھتے دیکھتے اپنی آغوش میں
سب چھپالے گیا
آسماں چپ.................
تباہ حال بے گھر بڑھتے ہی گئے
لیکن
ایک نیا سورج ان کے ساتھ تھا
اور دل دل میں کنول کھل رہے تھے

سناٹے میں ڈوبے ہوئے
مکان، راستے، انسان
تیرگی کے گھنے گھنے سائے
سکوت کی دبیز چادر
نیندوں کی سرسبز وادیاں
خوابوں کے انوکھے طلسم
.....ٹوٹنے کے منتظر
مگر یہ کون جاگ رہا ہے.....؟
نرم و نازک ہواؤں کی آہٹ پر
.................چونکتا ہے
آس کے جگنو چمکتے ہیں
اور اگلی آہٹ کے انتظار میں
بجھنے لگتے ہیں

Raunaq Jahan Zaidi
Milhal Plaza
New Burhan Public School
Tayyab Colony
Aligarh-202001 (U.P)

لذیذ پکوان

آلو پالک بنانے کی ترکیب

تیاری کا مکمل وقت: 15 منٹ، پکانے کا وقت: 20 منٹ
کتنے لوگوں کے لیے ہے: 2 افراد

اجزا: 4 کپ پالک کے پتے، 1 چائے کا چمچ آئل، 1 کپ پیاز کٹے ہوئے، 2 چائے کے چمچ ادرک پیسٹ، 2 چائے کے چمچ لہسن پیسٹ، 1 کپ آلو ابلے ہوئے اور چھلے ہوئے، 2 کھانے کے چمچ دودھ، 1 چائے کا چمچ پسی ہوئی سرخ مرچ، 1 چائے کا چمچ پنجابی چول مسالہ، نمک حسب ذائقہ، برائے گارنش 1 کھانے کا چمچ کریم

تیار کرنے کی ترکیب: ایک دیگچی میں پانی ابالیں۔ اس پانی میں 2 تا 3 منٹ تک پالک کے پتے دھوئیں۔ پتوں کو نچوڑ لیں۔ ایک مکسر میں بلینڈ کر کے ایک ہموار پیسٹ بنا لیں۔ اس پیسٹ کو ایک جانب رکھ دیں۔ اب ایک پین میں آئل گرم کریں۔ آئل میں پیاز شامل کریں اور اس وقت تک بھونیں حتیٰ کہ پیاز شفاف بن جائے۔ اب اس میں ادرک پیسٹ اور لہسن پیسٹ شامل کریں۔ 1 تا 2 منٹ تک پکائیں۔ پالک پیسٹ، آلو، دودھ، پسی ہوئی سرخ مرچ، پنجابی چول مسالہ، نمک اور ایک کپ پانی شامل کریں۔ 5 تا 7 منٹ تک پکائیں حتیٰ کہ گریوی (شوربہ) گاڑھا بن جائے۔ کریم کے ساتھ گارنش کریں۔

شلغم کی بھجیا بنانے کی ترکیب

تیاری کا مکمل وقت: 10 منٹ، پکانے کا وقت: 25 منٹ
کتنے لوگوں کے لیے ہے: 4 افراد

اجزا: شلغم آدھ سیر، گھی ڈیڑھ چھٹانک، پیاز ایک عدد، لہسن چار جوے، دہی آدھ پاؤ، نمک مرچ حسب پسند، سبز دھنیا اور مرچ حسب ضرورت

تیار کرنے کی ترکیب: شلغم دھو کر چھیلیں اور چھوٹے چھوٹے قتلے

کاٹ لیں۔ایک دیگچی میں اتنا پانی ڈالیں کہ شلغم بھی گل جائے اور پانی بھی خشک ہوجائے

شلغم ابال کر اور مسل کر انھیں ایک طرف رکھ دیں اس کے بعد دیگچی میں گھی کڑکڑائیں۔اس میں پیاز،لہسن بادامی کرلیں اور دہی کے ساتھ دیگر مصالحے ڈال کر بھونیں۔جب گھی چھوڑنے لگے تو شلغم کا کچومر بھی شامل کریں اور بھونیں۔ہری مرچ اور دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور دم دے دیں۔

کڑاہی پنیر بنانے کی ترکیب

تیاری کا مکمل وقت:5 منٹ، پکانے کا وقت:25 منٹ

کتنے لوگوں کے لیے ہے:4افراد

اجزا: ڈیپ فرائی کرنے کے لیے آئل

3 کپ پنیر(کاٹج پنیر)Cubes میں کٹا ہوا،3 کھانے کے چمچ مکھن،1 چائے کا چمچ سوکھا دھنیا(سالم)خشک روسٹ کردہ اور کچلا ہوا،1 چائے کا چمچ ادرک پیسٹ،1 کپ ٹماٹر کٹے ہوئے،1 چائے کا چمچ پسی ہوئی سرخ مرچ،1 کپ کریم،1 چائے کا چمچ قصوری میتھی(سوکھی میتھی)، نمک حسب ذائقہ،1 چائے کا چمچ پسی ہوئی الائچی،1 کھانے کا چمچ پنجابی گرم مصالحہ

برائے گارنش:2 کھانے کے چمچ دھنیا کٹا ہوا

تیار کرنے کی ترکیب: ایک کڑاہی میں آئل گرم کریں۔آئل میں پنیر کے مکعب (Cubes) ڈیپ فرائی کریں حتیٰ کہ وہ سنہری براؤن رنگت اختیار کرلیں۔آئل جذب کرنے والے کاغذ پر نچوڑ لیں۔نچوڑنے کے بعد انھیں 15 منٹ تک گرم پانی میں ڈال دیں۔دوبارہ نچوڑ لیں اور ایک جانب رکھ دیں۔ایک کڑاہی میں مکھن گرم کریں۔مکھن میں سوکھا دھنیا شامل کریں۔2 منٹ تک بھونیں۔ادرک پیسٹ شامل کریں۔مزید 1 منٹ تک بھونیں اور ٹماٹر شامل کریں۔اس وقت تک بھونیں حتیٰ کہ آئل گریوی (شوربے) سے علیحدہ ہوجائے۔پسی ہوئی سرخ مرچ، کریم، سوکھی میتھی اور نمک شامل کریں۔3 تا 4 منٹ تک ابلنے کے قریب آگ پر پڑا رہنے دیں۔اب اس میں پنیر شامل کریں۔اس کے ساتھ ساتھ پسی ہوئی الائچی اور پنجابی گرم مصالحہ شامل کریں۔بخوبی مکس کریں۔3 تا 4 منٹ تک ابلنے کے قریب آگ پر پڑا رہنے دیں۔دھنیا کے ساتھ گارنش کریں۔گرما گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔

گلابی چائے بنانے کی ترکیب

تیاری کا مکمل وقت:5 منٹ، پکانے کا وقت:45 منٹ

کتنے لوگوں کے لیے ہے:8افراد

اجزا: سبز چائے کی پتی 1 چائے کا چمچ،2 کھانے کا سوڈا 1/6 چائے کا چمچ، خوب گاڑھا دودھ ایک کپ، چینی دو چائے کے چمچ، پسی ہوئی الائچی چار عدد، پستہ بادام کٹے ہوئے کم مقدار میں، پانی 5 کپ

تیار کرنے کی ترکیب: دو کپ سادے پانی میں پتی اور کھانے کا سوڈا ڈال کر بھگو دیں۔دو گھنٹے بعد چائے بنانے کے برتن میں چولہے پر رکھیں۔برتن کا منہ کھلا ہو۔جو میل اوپر آئے اسے چائے کی چھلنی سے نکالتی رہیں اور چمچ چلاتی رہیں۔ابلنے لگے تو دو کپ ٹھنڈا پانی ڈالیں۔کسی چھوٹے مگ یا گہرے بڑے چمچ سے چائے کو بار بار اچھالیں۔چینی اور الائچی ڈال دیں۔10 منٹ بعد ایک کپ ٹھنڈا پانی مزید ڈالیں۔تین منٹ تک اچھال کر دودھ ڈال دیں۔ابال آجائے تو اتار لیں۔چھان کر پیالیوں میں نکالیں۔اوپر سے بالائی اور میوہ ڈال کر پیش کریں۔

(بحوالہ:www.urdupoint.com)

ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی

صحت خواتین سے متعلق رہنما اصول

مرزا غالب نے کہا تھا۔

تنگ دستی اگرچہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

خاص طور سے آج کے دور میں جب مشینی زندگی اور تیزی سے بدلتے طرز رہائش (لائف اسٹائل) نے صحت کے حوالہ سے بہت سی نئی بیماریوں کو جنم دیا ہے جن کا قدیم زمانہ میں تصور تھا نہ وجود، دیکھا جائے تو اس سے سب سے زیادہ خواتین متاثر ہوئی ہیں۔ایک طرف باورچی خانہ میں ہونے والی جسمانی ورزش کے انداز بدلنے سے جسم میں چربی بڑھنے لگی، مکسر نے مصالحہ پیسنے کا تصور ختم کیا تو دیر تک کھڑے رہنے سے کمر کا درد عام ہوگیا، چکنی غذاؤں اور فاسٹ فوڈ کی کثرت نے جسم میں خراب مادوں کے جمع ہونے کے امکانات مزید بڑھادیئے دوسری طرف چہل قدمی کا معاملہ تو بالکل ختم ہوگیا، سفری سہولیات اور نقل وحمل (Transport) کی آسانی سے دستیابی نے تو اب کہیں آنے جانے میں بھی پیدل چلنے کا رواج ختم کردیا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ جسم میں کولسٹرال، یوریا، تھائرائڈ، جوڑوں کے آس پاس کے مادے (Synovial fluid) کے سخت ہونے سے جوڑوں کے درد (Arthritis) نے اپنا قبضہ گردن کے درد (Spondylitis) سے لے کر پیر کے انگوٹھے کے درد نقرس (Gout) تک جمالیا اور سانحہ یہ ہے کہ یہ ساری مصیبتیں ہم نے اپنے آپ پیدا کی ہیں جو روز بہ روز بڑھتی جارہی ہیں۔

اس مضمون میں ہم چند بنیادی اصول پیش کررہے ہیں جن پر عمل کرکے خواتین صحت مند رہ سکتی ہیں۔

1۔مکسر کے بجائے سل بٹہ پر مصالحہ پیسنے کی عادت ڈالیں

آج کی نئی نسل شاید سل بٹہ سے واقف بھی نہ ہو اس نے تو آنکھ کھول کر مکسر اور جوسر دیکھا اور اب تو یہ اسٹیٹس سمبل بھی بن گیا ہے حالانکہ سل اور بٹہ سے مصالحہ پیسنے میں لذت دوبالا ہوجاتی ہے دوسری طرف مصالحہ پیسنے سے پیٹ کے عضلات (Abdominal Muscles)، جگر اور معدہ کے ورم بھی ختم ہوجاتے ہیں۔اس ورزش سے گردن سے کمر تک کے ریڑھ کے مہروں (Vertebrae) کی ورزش ہوتی ہے ان کے اعصاب میں چستی آتی ہے اسی طرح جوڑوں کے درد میں بھی نمایاں فائدہ ہوتا ہے۔

2۔پانی خوب پئیں

آج پانی پینے کا رواج بہت کم ہوگیا ہے حالانکہ صرف سادہ پانی اگر اچھی مقدار میں پیا جائے تو گردوں اور دل کی رگوں سمیت جسم کے تمام حصوں سے خراب مادوں کی صفائی ہوجاتی ہے جسے آپ قدرتی طور سے ڈائلے سس کا عنوان دے سکتے ہیں اس کے علاوہ پانی پینے سے جلد کے رنگ میں نکھار آتا ہے، جسم کی خشکی کم ہوجاتی ہے خاص طور سے بالوں میں

تری پیدا ہو کر سر سے بھوسی کا جھڑنا کم ہو جاتا ہے۔

3۔ ریشے دار سبزیاں زیادہ استعمال کریں

جدید تحقیق سے اب یہ بات سامنے آئی ہے کہ ریشے دار ہری سبزیوں، پتوں اور پھلوں کو کھانے سے جسم کو طاقت ملتی ہے، معدہ اور آنتوں کی صفائی ہو جاتی ہے خاص طور سے جسم کے اندر امراض کا مقابلہ

کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اسی لیے اسے کینسر جیسی مہلک بیماری میں بھی مفید بتاتے ہیں، اطباء یونان اس حقیقت سے بہت پہلے سے واقف تھے ان کے یہاں کرم کلہ، چقندر، مولی کے پتوں، مکو کے پتوں اور کاسنی کے پتوں کی سبزی کھانے کا رواج عام تھا اس کے علاوہ انجیر، منقی، سنگترہ، موسمی، گاجر، لیموں ناشپاتی، انناس، سیب اور انار جیسے پھلوں کو غذا کا جز قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ تمام سبزیاں اور پھل قبض دور کرتے ہیں اور پیشاب لا کر جسم سے نہ صرف فاضل مادوں کو باہر نکالتے ہیں بلکہ اسے طاقت ور بھی بناتے ہیں۔

4۔ کم از کم پندرہ منٹ دھوپ میں بیٹھیں

آج کل اے سی اور روم ہیٹر کے رواج سے انسان نے اپنے کو کمرہ میں قید کر دیا ہے کسی شاعر نے صحیح لکھا ہے:

کھڑکیاں ہی کھول دو گر بند دروازہ رہے
آتے جاتے موسموں کا کچھ تو اندازہ رہے

کمرہ میں بند رہنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ گرمی اور سردی کا احساس نہیں رہا یہ اے سی تو پسینہ کو نکلنے بھی نہیں دیتے حالانکہ بہت سے امراض کے لیے اطباء پسینہ لانے والی دواؤں کی مالش یا ان کے جوشاندے میں بیٹھ کر جلد کے سوراخ (Pores) کو کھولتے اور پسینہ لا کر خراب مادوں کو باہر نکالنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ پسینہ جسم کی گہرائیوں سے

مادہ کو باہر نکالتا ہے خاص طور سے جلدی امراض جوڑوں کے درد اور موٹاپا کے لیے یہ طریقہ بے حد مفید ہے۔ ظاہر ہے ان جوشاندوں میں روز بیٹھنا ممکن نہیں ہے تاہم یہ مقصد صرف 15 منٹ تک دھوپ میں بیٹھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

5۔ غرغرہ اور بھپارہ کو زندگی کا معمول بنائیں

صرف گرم پانی سے غرغرہ (کلی) کرنے سے نہ صرف حلق اور سینہ سے بلغم کا اخراج ہوتا ہے بلکہ ناک کے ارد گرد جمع مادہ کو ملائم بنا کر ناک کے راستہ بلغم باہر نکل جاتا ہے یہی فائدہ گرم پانی کے بھپارہ (Inhalation) سے ہوتا ہے اس طریقہ سے دماغ کے اندر پیدا ہونے والے ٹیومر کو گلانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

6۔ 30 منٹ روزآنہ پیدل چلیں

ہم لکھ چکے ہیں کہ سواری کی سہولت نے ہمیں چلنے پھرنے سے معذور بنا دیا ہے اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم جتنی توانائی (Energy) لیتے ہیں اس کا دس فیصد بھی خرچ نہیں کرتے نتیجہ کے طور پر ذیابطیس اور ہائی بلڈ پریشر جیسے امراض روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں اس کے لیے روزآنہ صبح یا رات کو کم از کم ۳۰ منٹ ضرور چلیں اگر باہر ممکن نہ ہو تو گھر کے اندر ہی دس بیس چکر لگانے سے مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جدید تجربہ اور قدیم طبی لٹریچر سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اگر خواتین ان اصولوں پر پابندی سے عمل کرے تو انشاء اللہ مذکورہ بالا امراض کی پیدائش کو روکا جا سکتا ہے۔

Dr. S. M. Hassan Nigrami
Dr. Hassan Herbal Clinic
Behind Medah Ganj Police Chowki
Sitapur Road, Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

چہرے کی جھریاں ختم کرنے کے لیے ماسک

بہت سی خواتین چہرے کی بدنما جھریوں سے پریشان رہتی ہیں۔ کچھ خواتین میں یہ جھریاں عمر کے بڑھنے کے ساتھ نمایاں ہونے لگتی ہیں لیکن بہت سی خواتین میں اس قسم کی جھریاں بہت سی اور وجوہات کی بنا پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔اس ماسک کے استعمال سے خواتین کے چہرے کی جھریاں کسی حد تک کم ہو جاتی ہیں۔

اجزا: بیسن ایک ٹی سپون، شہد دو ٹی سپون، گلیسرین دو ٹی سپون، کریم تین ٹی سپون

طریقہ استعمال: ان تمام چیزوں کو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اتنا مکس کریں کہ ہر چیز کریم کے ساتھ یک جان ہو جائے۔اب اس پیسٹ کو چہرے اور گردن پر اچھی طرح لگالیں۔

تقریباً پندرہ منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر صاف پانی سے منہ دھولیں۔

افادیت: اس ماسک کے استعمال سے آپ کے چہرے کی جھریاں دور ہوں گی اور جلد شاداب ہو جائے گی۔

چہرے کے لیے بیوٹی ٹپس

جب آپ کسی سے ملتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی نظر آپ کے چہرے پر پڑتی ہے اور اگر چہرہ خوبصورت ہوگا تو دیکھنے والے پر آپ کا ایک اچھا تاثر پڑے گا۔لیکن چہرے کو خوبصورت بنائے رکھنے کے لیے آپ کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ذیل میں آپ کو کچھ چھوٹے

ٹوٹکے بتا رہے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنے چہرے کو خوبصورت رکھ پائیں گی اور یہ ٹوٹکے آپ کے چہرے کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

1: تازہ اور چمکدار جلد کے لیے دو ٹیبل سپون دہی میں تین قطرے سفید سرخ ملا دیں اسے دس منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں اور پھر دھولیں یہ آپ کے چہرے کو تروتازگی اور چمک کے ساتھ فیشیل جیسی خاصیت فراہم کرے گا۔

2: اگر صبح اٹھنے پر آپ کا چہرہ سوجن کا شکار ہو جاتا ہو تو نیم گرم پانی سے بھرا ایک برتن لیں اور اس میں مسٹرڈ پاؤڈر ملا لیں ایک تولیے کو اس پانی میں ڈال کر بھگو لیں اور پھر نچوڑ کر اس کو چہرے کے اردگرد لپیٹ لیں یہ آپ کے چہرے کی سوجن کم کر دے گا۔

3: چہرے کے سیاہ دھبے دور کرنے کے لیے روزانہ عرق گلاب استعمال کریں یہ آپ کے چہرے کے سیاہ دھبے دور کر کے چہرے کی چمک بڑھاتا ہے۔

5: ٹماٹر کا کٹا ہوا ٹکڑا لیں 5 منٹ تک چہرے اور گردن کے اردگرد ہلکا ہلکا رگڑیں یہ آپ کے چہرے کے مسام سے گرد و غبار کو جذب کرتا ہے اور چہرے کی چمک بڑھاتا ہے۔

6: اگر آپ کے چہرے پر چھائیاں یا بلیک ہیڈز ہیں تو ان ہدایت پر عمل کریں۔

ایک کھانے کا چمچ لیموں کا رس، ایک چٹکی بورک ایسڈ اور ایک چٹکی چینی لیں ان سب کو اچھی طرح سے ملا لیں اور کچھ دن کے لیے چھوڑ دیں اس کے بعد چہرے کے متاثرہ حصے پر لگائیں کچھ دن تک یہ عمل کریں۔ آپ کو اپنی جلد میں بہت فرق محسوس ہوگا۔

7: دو قطرے لیموں کے رس میں 6 قطرے زیتون کے تیل کے ملا لیں اور نہانے کے بعد گیلے بالوں میں سر کی جلد میں مساج کریں اور دھوپ میں بالوں کو سوکھنے دیں یہ آپ کے بالوں کے لیے موئسچرائزر کی طرح کام کرتا ہے۔

8: خشک جلد اور سردی کی خارش کے لیے ایک بالٹی پانی میں ایک چائے کا چمچ نمک ڈال کر نہائیں۔

9: چند پکی ہوئی اسٹرابری لے کر کریم کے ساتھ پیس لیں اور اس مکسچر کو چہرے پر لگائیں یہ خشک جلد کے لیے ایک بہترین ماسک ہے۔

10: بادام یا زیتون کا تیل لے کر اس کو ہر رات کو سونے سے پہلے گردن پر اچھی طرح لگائیں یہ گردن کی سیاہی ختم کرنے کے لیے بیحد مفید ہے۔

11: کوئی بھی سوکھی مٹی لے کر اس میں عرق گلاب اور لیموں کا جوس ملائیں اور اس مکسچر کو ہفتے میں دو سے تین بار لگائیں یہ آپ کے چہرے کی فالتو چکنائی جذب کر کے اس کو تروتازگی دیتا ہے۔

12: پیاز کا رس بالوں میں لگانے سے بال گرنا بند ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے بال اگنے لگتے ہیں۔

چہرے کے بالوں سے تنگ خواتین حاضر ہوں

ایک پیالی میں لیموں کا رس لے کر اس میں 30 گرام چینی شامل کریں اور اچھی طرح حل کر لیں۔ اب اس محلول کو چہرے کے بالوں پر لگائیں اور 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد تازہ پانی سے دھو لیں، یہ عمل ہفتے میں ایک بار ضرور کریں۔

بیسن، ہلدی اور دہی کو مکس کریں اور اس محلول کو چہرے پر تب تک لگا رہنے دیں جب تک یہ خشک نہ ہو جائے۔ یہ آپ کے چہرے پر اضافی بالوں کو پیدا ہونے سے روکے گا۔

پپیتے اور ہلدی کو مکس کریں اور اس سے چہرے کا مساج کریں۔ یہ آپ کے چہرے سے غیر ضروری بال بھی صاف کرے گا اور ساتھ ہی اسے تروتازہ بھی رکھے گا۔

کیلے اور جو کو مکس کریں اور اس محلول کو چہرے پر 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ اس ٹوٹکے کو ہفتے میں دو بار دہرائیں اور تروتازہ بالوں سے پاک چہرہ پائیں۔ (بحوالہ: www.roopsuraksha.com)

تاثرات: نگرنگر سے

ماہنامہ خواتین دنیا کی اشاعت کا وقوع پذیر ہونا ایک تاریخی قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس بات سے غالباً اردوداں طبقہ متفق ہوگا کہ زمانہ قدیم ہی سے خواتین دوسرے درجے کی مخلوق سے تعبیر کی جاتی رہی ہیں، جس کی وجہ سے ادب میں بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو وہ سراہنا نصیب نہیں ہوسکی جس کی وہ حق دار تھیں، کیوں کہ حوصلہ شکنی ہر فنکار کا حوصلہ پست کر دیتی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں 'آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان' ماہنامہ خواتین دنیا ایک خوش آئند پہل ہے جو طبقہ اناث کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس رسالے کے ذریعے صنفی امتیاز کو کسی حد تک کم کرنے کی غرض سے ان خواتین کو لب کشائی کا موقع فراہم کیا، جو پدرانہ تسلط کی وجہ سے اپنی نگارشات کو منظر عام پر لانے سے قاصر تھیں۔

میرے سامنے اس وقت ''خواتین دنیا'' کا نومبر 2018 اور دسمبر 2018 کا شمارہ ہے۔

فی زمانہ مذکورہ رسالہ واقعی میں خواتین کی فنکارانہ صلاحیتوں کو دنیائے ادب سے متعارف کرانے میں کلیدی رول ادا کر رہا ہے۔

نومبر کے مجلّہ کے بصیرت افروز مضامین بالخصوص ''مالوہ کی شاعرہ: مہر النساء مہر زریں اور'' اردو کی اولین نسائی آواز: رشیدۃ النساء بیگم'' دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ''شاعرات کے منتخب اشعار'' ادارے کے نظر انتخاب کی اعلیٰ اور بہترین مثال ہے۔ ''خواتین دنیا'' کی جو بات اردو کے نسائی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہے وہ خواتین کی صحت سے متعلق معلوماتی اور اہم مضامین ہیں۔ ڈاکٹر احسان رؤف کا مضمون ''حمل کے زمانہ میں قبض: اسباب اور علاج معلوماتی مضمون ہے۔

''خواتین دنیا'' کے دسمبر 2018 کے شمارے میں 'امرتا پریتم' کی شخصیت پر ڈاکٹر جی۔ ایم پٹیل کا مضمون مجھے پسند آیا۔ جسے پڑھنے کے بعد امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی کی عشقیہ داستان تفصیلاً معلوم ہوئی۔ علاوہ ازیں صغرا مہدی کے ناولٹ 'کوئی درد آشنا بھی نہیں' کا تجزیاتی مطالعہ، 'بیسویں صدی کی نسائی آواز: پروین شاکر' وغیرہ جیسے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

الغرض ملک میں جہاں خواتین کو با اختیار بنانے کے لیے کئی تنظیمیں متحرک اور فعال ہیں، وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے رسالہ ''خواتین دنیا'' کی اشاعت اپنے انداز کی ایک منفرد پہل ہے۔ میں رب العزت کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ رسالہ اسی ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے طبقہ نسواں کو فیض پہنچاتا رہے۔

رفیہ نبی، ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

آسمانِ ادب کا تابندہ ستارہ' ماہنامہ خواتین دنیا' لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنتا جا رہا ہے۔ خواتین دنیا ایک ایسا نایاب رسالہ ہے جو اردو دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ قابل ستائش اور قابل تعریف ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو اتنی محنت اور مشقت سے اس پیارے رسالے کو سنوار کر ہم تک پہنچا رہی ہے۔ یہ پیارا رسالہ اپنی روشنی سے ہمارے گھروں کو منور کر رہا ہے۔ اکتوبر 2018 کے اس ممتاز رسالے میں میرا افسانہ 'بھولی ہوئی یادوں کی کسک' شائع ہوا ہے۔ دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعا گوں ہوں اپنے اس جان عزیز رسالے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے۔ یہ رسالہ ایک پھول ہے جس کی خوشبو سانسوں کو بہت بھلی محسوس ہوتی ہے۔ خواتین دنیا میں ہر ماہ نئے نئے موضوعات پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ یہ پیارا رسالہ اسی طرح ترقی کرتا رہے۔ آمین

رضوانہ ساگر روزی، اچلپور، امراوتی، مہاراشٹر

□□□

خواتین خبر نامہ

وزیر اعظم نے کشمیر کی بیٹی عنایہ نثار کی کارکردگی کو سراہا

نئی دہلی، 31 دسمبر (یو این آئی) وزیر اعظم نریندر مودی نے 2018 میں کھلاڑی بیٹیوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی کامیابی سے تحریک ملتی ہے۔ ماہانہ پروگرام 'من کی بات' میں اتوار کو کہا کہ ہر معاشرے میں کھیل کود کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ میں کشمیر کی ایک بیٹی عنایہ نثار کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جس نے کوریا میں کراٹے چمپئن شپ میں سونے کا تمغہ جیتا۔ عنایہ 12 سال کی ہے اور

کشمیر کے اننت ناگ میں رہتی ہے۔ عنایہ نے محنت اور تندہی سے کراٹے کی مشق کی، اس کی تفصیلات کو جانا اور خود کو ثابت کر کے دکھایا۔ میں تمام ہم وطنوں کی طرف سے اس کے روشن مستقبل کا متمنی ہوں۔ عنایہ کو ڈھیر ساری مبارک باد اور دعائیں۔ وزیر اعظم نے ایک نوجوان باکسر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 16 سال کی ایک بیٹی رجنی کے بارے میں میڈیا میں بہت بحث ہوئی ہے۔ آپ نے بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ رجنی نے جونیئر خواتین باکسنگ چمپئن شپ میں گولڈ میڈل جیتا ہے۔ جیسے ہی رجنی نے تمغہ جیتا وہ فوری طور پر ایک قریبی دودھ کے اسٹال پر گئی اور ایک گلاس دودھ پیا۔ اس کے بعد رجنی نے اپنے میڈل کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور بیگ میں رکھ لیا۔ انھوں نے کہا کہ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ رجنی نے ایک گلاس دودھ کیوں پیا؟ اس نے ایسا اپنے والد جسمیر سنگھ جی کے اعزاز میں کیا جو پانی پت کے ایک اسٹال پر لسی فروخت کرتے ہیں۔ رجنی نے بتایا کہ ان کے والد نے اسے یہاں تک پہنچانے میں بہت قربانی دی ہے، بہت تکلیف برداشت کی ہے۔ جسمیر سنگھ ہر صبح رجنی اور ان کے بھائی بہنوں کے اٹھنے سے پہلے ہی کام پر چلے جاتے تھے۔ رجنی نے جب اپنے والد سے باکسنگ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے تمام ممکنہ ذرائع جٹا کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔ مسٹر مودی نے کہا کہ رجنی کو باکسنگ کی مشق پرانے دستانے کے ساتھ شروع کرنا پڑی کیونکہ ان دنوں ان کے خاندان کی اقتصادی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اتنی ساری رکاوٹوں کے بعد بھی رجنی نے ہمت نہیں ہاری اور باکسنگ سیکھتی رہی۔ اس نے سربیا میں بھی ایک تمغہ جیتا۔ میں رجنی کو مبارک باد اور دعائیں دیتا ہوں اور رجنی کا ساتھ دینے اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے والدین

جسمیر سنگھ جی اور آشارانی جی کو بھی مبارک باد دیتا ہوں۔ وزیر اعظم نے پنے کی 20 سالہ بیٹی ویدانگی کلکرنی کا بھی ذکر کیا جو اسی ماہ سائیکل سے دنیا کا چکر لگانے والی سب تیز ایشیائی بن گئی ہیں۔ مسٹر مودی نے کہا کہ وہ 159 دنوں روزانہ تقریباً 300 کلومیٹر سائیکل چلاتی تھی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں روزانہ 300 کلومیٹر سائیکلنگ! سائیکل چلانے کے تئیں ان کا جذبہ واقعی قابل ستائش ہے۔

میوات کی پہلی میو مسلم خاتون بنی سنسکرت کی لکچرر، شبنم کی کامیابی دوسری لڑکیوں کے لیے مشعل راہ

شبنم نے کہا کہ سنسکرت کو دوسری کمیونٹی کے لوگوں کی زبان سمجھا جاتا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے، سماج کے ہر آدمی کو اس کی سمجھ ہونی چاہیے۔

انقلاب دہلی۔ 3 جنوری، نوح، میوات (اسٹاف رپورٹر) تحصیل فیروز پور جھرکہ کے گاؤں احمد باس کی رہنے والی شبنم نے سنسکرت زبان میں پی جی ٹی کا عہدہ حاصل کرکے علاقے کا نام روشن کیا ہے۔ واضح رہے کہ شبنم علاقہ میوات کی پہلی ایسی مسلم خاتون ہیں جو سنسکرت میں لیکچرر کے

عہدے پر فائز ہوئی ہیں۔ اس طرح شبنم کی یہ کامیابی میوات کی دیگر بیٹیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ شبنم نے انقلاب سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا بچپن سے ہی سنسکرت میں لیکچرر بننے کا خواب تھا۔ شادی کے بعد لگا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا لیکن وہ بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر سرفراز انجم نے میری حوصلہ افزائی کی، جس سے وہ اس مقام تک پہنچی۔ شبنم نے کہا کہ سنسکرت زبان کو دوسری کمیونٹی کے لوگوں کی زبان سمجھا جاتا ہے، لیکن میرا ماننا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے، سماج کے ہر آدمی کو اس کی سمجھ ہونی چاہیے۔

شبنم کا خاندان تعلیم یافتہ ہے۔ ان کی شادی احمد باس میں سرفراز انجم سے ہوئی تھی، جبکہ ان کا تعلق راجستھان تجارہ تحصیل سے ہے۔ ان کے والد شہر الور میں وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ بھائی سمیع اللہ خان بی ایس این ایل میں ملازم ہیں۔ دوسرے بھائی ناظم حسین وکالت کے پیشے سے جڑے ہوئے ہیں۔ شبنم کے تیسرے بھائی نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے پڑھائی کی ہے اور اس وقت وہ انگلینڈ میں سافٹ ویئر انجینئر ہیں۔ چوتھے بھائی ایک کمپنی میں سوفٹ ویئر انجینئر ہیں۔ شبنم کی تین بہنیں ہیں جو سبھی سرکاری ملازم ہیں، اسی کے سبب انھیں تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا ماحول ملا۔ شبنم کا کہنا ہے کہ ضلع نوح میں تعلیم نسواں کے اعداد و شمار آبادی کے تناسب سے بہت ہی کم ہے، اس لیے وہ میوات کی بیٹیوں کو تعلیم دے کر انھیں مضبوط بنانا چاہتی ہیں۔

سمرتی مدھانا آئی سی سی پلیئر آف دی ایئر

راشٹریہ سہارا، یکم جنوری۔ دبئی (ایجنسیاں) انٹرنیشنل کرکٹ کونسل (آئی سی سی) نے سال 2018 کے اختتام پر ویمنز کھلاڑیوں کے لیے ایوارڈ کا اعلان کیا۔ ہندوستان کی سمرتی مدھانا نے کرکٹر آف دی ایئر اور ون ڈے پلیئر آف دی ایئر ایوارڈ اپنے نام کیا۔ وہ 11 برس بعد آئی سی سی ایوارڈ جیتنے والی پہلی ہندوستانی کھلاڑی ہیں، آخری مرتبہ 2007 میں ہندوستان کی فاسٹ بالر جھولن گوسوامی نے آئی سی سی ایوارڈ جیتا تھا۔ ایلیسا

ہیلی ٹی ٹوئنٹی اور سو فی ایکلیسٹون ایمرجنگ پلیئر آف دی ایئر قرار پائیں۔ آئی سی سی نے یکم جنوری 2018 سے 31 دسمبر 2018 کے دوران ونڈے اور ٹی ٹوئنٹی انٹرنیشنل کرکٹ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی ویمنز کھلاڑیوں کے لیے سالانہ ایوارڈ کا اعلان کر دیا جس کے تحت ٹاپ آرڈر ہندوستانی بلے باز سمرتی مدھانا کرکٹر آف دی ایئر اور ون ڈے پلیئر آف دی ایئر ایوارڈز جیتنے میں کامیاب رہیں، آسٹریلوی وکٹ کیپر ایلیسا ہیلی نے ٹی ٹوئنٹی پلیئر آف دی ایئر جبکہ انگلینڈ کی انڈر 19 کرکٹر سوفی ایکلیسٹون نے ایمرجنگ پلیئر آف دی ایئر ایوارڈز اپنے نام کیے۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمن اعظمی

صفحات: 410

قیمت: 185 روپے

نو آبادیات اور علاحدگی پسندی کی مزاحمت مظفر پور کے مسلمان 1857 کے بعد

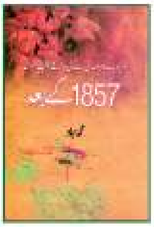

مصنف: محمد سجاد، مترجم: زریش ندیم

صفحات: 333

قیمت: 160 روپے

متوازن غذا اور صحت

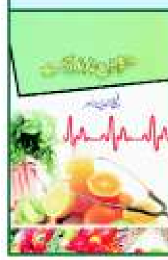

مصنف: رفیع الدین ناصر

صفحات: 194

قیمت: 115 روپے

ملا رموزی

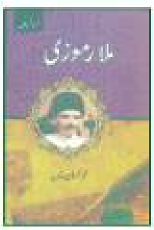

مصنف: محمد نعمان خاں

صفحات: 128

قیمت: 80 روپے

سید امتیاز علی تاج

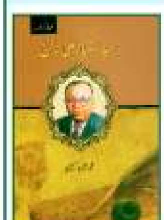

مصنف: محمد شاہد حسین

صفحات: 136

قیمت: 80 روپے

عصمت جاوید

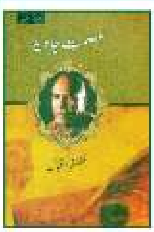

مصنف: غضنفر اقبال

صفحات: 102

قیمت: 68 روپے

غواصی

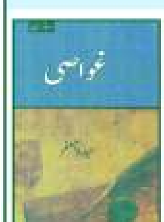

مصنف: سیدہ جعفر

صفحات: 140

قیمت: 82 روپے

ریاض خیر آبادی

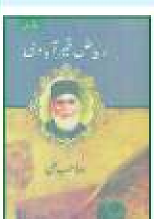

مصنف: صاحب علی

صفحات: 115

قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2019, Vol. 03, Issue: 2 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025